# عبدالرحیم خانخاناں

شیخ سلیم احمد

# عبدالرحیم خانخاناں

شیخ سلیم احمد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

# ABDUR RAHIM KHAN KHANA

by

*Sheikh Saleem Ahmad*

Year of Edition 2008
ISBN 81-8223-325-9
Price Rs.

| | |
|---|---|
| نام کتاب | عبدالرحیم خانخاناں |
| مصنف | شیخ سلیم احمد |
| سنِ اشاعت | ۲۰۰۸ء |
| قیمت | |
| مطبع | عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی |

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax: 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

# انتساب

एके साधे सब सधे, सब सधे सब जाय।

रहिमन मूलहि सीचिंबो फूलही फलंही आघाय।।

(रहीम)

ایک بنیادی کام اچھی طرح پورا کرلو ہر کام میں ہاتھ مت ڈالو، ایک درخت کی جڑ پر محنت کرلو تو سارے پھل پھول تمہارے ہو جائیں گے۔

# فہرست

☆☆

# پیش لفظ

(نظرثانی شدہ دوسرا ایڈیشن)

یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں کی مختصر سوانح ہے۔ مگر اس کے عہد کے فکری دھارے کو پیش کرنے کی کوشش بھی ہے۔ خانخاناں اس فکری دھارے کی علامت کے طور پر اُبھرتا ہے۔ اکبری اور جہانگیری عہد مغلیہ سلطنت کا سنہری دور ہے۔ جس میں نظریات و خیالات کی بڑی ہلچل ہے۔ مسلم حکومت کو ہندستان میں چار سو سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے اور ہندو مسلمانوں کے اشتراک عمل سے ایک نئی تہذیب کے خدوخال نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک ایسا سماج وجود میں آچکا تھا، رواداری، محبت، باہمی افہام و تفہیم کا جذبہ صلح کل، جیو اور جینے دو کا رویہ جس کی عام خصوصیات تھیں۔ ترقی پذیر بولیاں ہوں یا فن تعمیر، رہن سہن ہو یا لباس باہمی اشتراک عمل کی دلکش جھلکیاں ہر شعبہ زندگی میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ باہمی لین دین کے اس عمل کی رفتار اس عہد تک آتے آتے بہت تیز ہو گئی تھی۔ ہندستانی مسلمان ہندوستانیت کے رنگ میں رنگ رہے تھے اور خود ان کے مخصوص کلچر اور مذہب کی چھاپ ہندوؤں پر گہری پڑ رہی تھی۔ النّاس علیٰ دینِ مُلوکِھم کے اصول پر حکمراں طبقہ کے طور طریقے زیادہ اپنائے جا رہے تھے۔ امتزاج و ہم آہنگی کے اس عمل کو تیز تر کرنے میں دو مختلف تہذیبوں، جو ایک دوسرے سے متضاد بھی تھیں، کے تفاعل (Interacstion) سے ردوقبول کا عمل ضروری ہے۔ اس کے نتیجے

میں صوفی سنتوں، شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کا بڑا طبقہ وجود میں آچکا تھا جس میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے اور حکمراں طبقہ بادشاہ شہزادے، بیگمات، امرا اور روٴسا تھے۔ یہ عناصر تھے جو انڈو ایرانین تہذیب کو پروان چڑھانے میں مدد کر رہے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عہد میں ہندو مسلمان میں کوئی تفریق نظر نہیں آتی۔ مسلمان سپاہی ہندو آقا کے لیے لڑتا نظر آتا ہے اور ہندو سپاہی مسلمان سپہ سالار کے لیے جان نثار کرتا ہے۔ اکبر نے اتنی جنگیں لڑیں مگر وہ زیادہ تر مسلمان حکومتوں کے خلاف تھیں اور اس نے ایک بھی ہندو ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔

حضرت شیخ احمد سرہندی المعروف مجدّد الف ثانی کے منظر عام پر آنے سے یہ بساط الٹ جاتی ہے اور دوسری بساط بچھتی ہے جس پر مذہب کا رنگ غالب تھا۔ مجدّد الف ثانی کی آمد کے ساتھ ہندستان میں اسلام کے احیا کا آغاز اور بنیاد پرستی اور کٹر مذہبیت کا دور شروع ہوتا ہے۔ بعد میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جو تحریکات ابھریں وہ شیخ احمد سرہندی کے نظریات کی خوشہ چیں تھیں۔ بیسویں صدی میں مولانا مودودی، ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال جیسی مایہ ناز شخصیتوں کو متاثر کیا۔ اور موصوف کا یہ نظریاتی پودا آج بھی سرسبز و شاداب اور دنیا بھر میں اس کی بالادستی قائم ہوچکی۔ ان تحریکوں نے سولہویں اور سترہویں صدی کے متذکرہ بالا مشترکہ سماج کے رخ کو موڑ دیا اور فکر و خیال کا یہ دھارا مختلف سمت میں بہنے لگا۔ اس نئے انقلاب سے مسلمانوں کو کتنا نقصان پہنچا اور کتنا فائدہ ہوا، یہ موضوع علاحدہ سے ایک کتاب کا متقاضی ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مذہبی اعتبار سے یہ تحریکیں کامیاب رہیں اور ان بزرگان دین کی مخلصانہ کوششوں سے اسلام ہندستان میں ایک بلند منصب پر فائز ہوگیا مگر مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور وہ سیاسی اقتدار بھی قائم نہ رہ سکا جو ان تحریکوں کا بنیادی مطمح نظر تھا۔ مغلوں کے مضبوط مرکزی سیاسی نظام کے کمزور پڑتے ہی مسلمانوں کی کمزوریاں

منظر عام پر آنے لگیں اور یہ مذہبی تحریکیں اس انحطاط کے روکنے میں بری طرح ناکام رہیں۔ بعد کے واقعات اشارہ کرتے ہیں کہ رحیم کے عہد میں جو سماج تعمیر ہو رہا تھا وہ زیادہ فطری تھا اور اس کا تسلسل اگر درہم برہم نہ ہوتا تو شاید ملک تقسیم نہ ہوتا اور مسلمان اس ملک میں زیادہ عزت کی زندگی گزار سکتے۔

یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں اور اس کے عہد کا سرسری تعارف ہے۔ اسے قاری کے لیے ایک معلوماتی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں نظریہ و خیال زیادہ اہم ہوتا ہے۔ چونکہ یہ خیال ہی ہے جو زمان و مکان کے مجرّد خاکے میں رنگ بھرتا اور انہیں معنی عطا کرتا ہے۔ انسانی فکر ارتقا کی بنیاد ہے اور وہی تاریخ کے قافلہ کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس لیے کتاب میں نظریات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ حکمرانوں کے زیر سایہ صوفی سنتوں کی کاوشوں سے چودہویں اور سولہویں صدی میں جو ملوا ہندوستانی تہذیب جڑیں پکڑ چکی تھی وہ آج بھی باقی ہے اور اس تہذیب کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔

عبدالرحیم خانخاناں سے متعلق ہندی۔ اردو اور انگریزی میں جو بھی کتابیں یا مضامین میری نظر سے گذرے ہیں وہ مجھے یک طرفہ معلوم ہوئے۔ فارسی اور اردو میں رحیم کے ایرانی اور مغل پس منظر پر زیادہ زور ہے اور اس کی ہندی شاعری کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہندی شاعری کا ذکر آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ جبکہ ہندی اور کسی حد تک انگریزی میں صرف ہندی شاعری اور ہندو کلچر کو موضوع بحث بنایا گیا اور اس کے مغل یا مسلم پہلوؤں کو سرسری بیان کیا گیا ہے۔ ہندی مصنفین کے یہاں مغل تاریخ کے بہت سے واقعات کی صحت بھی مشتبہ ہے۔ میں نے اس کتاب میں اس کمی کی تلافی کی ہے۔ اور دونوں پہلوؤں میں تال میل پیدا کیا ہے اور رحیم کے ہندی اور ہندوستانیت کے پہلو کو بھی مغل پس منظر میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے اصل نمائندہ دوہوں کا انتخاب ان کے معنوں اور خصوصیات کلام کے ساتھ کتاب میں شامل کیا ہے تاکہ قاری خود بھی اس

کے کلام سے لطف اندوز ہو اور اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکے۔

عبدالرحیم خانخاناں کی ہندی شاعری کا معاملہ خاصا متنازع ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ رحیم کا موجودہ کلام رحیم کا نہیں ہے بلکہ اس کے عہد یا بعد میں کوئی دوسرا رحیم یا رحیمن تھا جس کا کلام خانخاناں سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ ہندی میں شیو سنگھ سینگر نے شیو سنگھ سروج نام سے کتاب لکھی جس میں اس نے یہ بحث اٹھائی ہے اور بھکاری داس کوی کی ایک کتاب کاویہ نرنیہ کے حوالہ سے دو رحیم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس بیان کو لے کر کچھ دوسرے ہندی ادیبوں نے بھی اسی طرح کے شک و شبہہ کا اظہار کیا ہے۔ اردو میں بزم تیموریہ میں مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن نے بھی رحیم کی ہندی شاعری پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔ مگر ہمیں یہی مان کر چلنا چاہئے کہ رحیم سے منسوب ہندی کلام رحیم ہی کا ہے۔ اور اس وقت یہی نظریہ درست ہے جب تک کہ اس کے برعکس شواہد نہیں مل جاتے۔ اس نظریہ کی تائید میں معاصر شواہد کافی ہیں۔

رحیم کی ہندی شاعری پر اس لیے بھی سوالیہ نشان لگایا جاتا ہے کہ کوئی ہمعصر مخطوطہ دستیاب نہیں۔ اب تک کی تمام اسناد رحیم کے ہندی شاعر ہونے پر اشارہ کرتی ہیں۔ مآثر رحیمی جو تین جلدوں پر پھیلی ہوئی رحیم کی سوانح عمری ہے اور جسے اس کے ایک درباری عبدالباقی نہاوندی نے اس کے حکم سے تحریر کیا تھا۔ اس میں اس کی ہندی شاعری کا ذکر ہے۔ اگرچہ شاعری کے نمونے نہیں دے۔ اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ اس زمانہ میں ہندی شاعری قابل اعتنا نہیں تھی۔ مآثر الامرا (شاہنواز خاں) میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ہندی اور سندھی میں بھی شاعری کرتا تھا اور رحیم تخلص کرتا تھا۔ ذخیرۃ الخوانین میں شیخ فرید کا ایک جملہ ملتا ہے جو یہ ہے۔ بزبان فارسی و ہندی و سندھی شعر متین می گفت۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ رحیم کا موجودہ ہندی کلام اسی کا ہے۔ اس کے علاوہ رحیم کو زبانیں سیکھنے کا خاص ملکہ تھا اور جس کا ذکر ہر کتاب میں کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے بادشاہ کے حکم سے کچھ

یورپی زبانیں بھی سیکھی تھیں۔ حجاز سے عربی اور نامانوس عربی بولیوں میں لکھے خطوط کے مطالب کے لیے اسی سے مدد لی جاتی تھی۔ متذکرہ بالا ہندی ادیبوں نے جس سند پر اپنے شک و شبہ کی بنیاد رکھی ہے وہ بھی ہم عصر نہیں ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں کی ہندی شاعری پر جس شخص نے اختصاص حاصل کیا ہے وہ مایا شنکر یا گک ہے جس نے اس صدی کے دوسرے دہے میں چھان بین کر کے رحیم کا منتشر کلام "رحیم رتنا ولی" کے نام سے یکجا کیا اور یہی کتاب تمام ہندی لکھنے والوں کا ماخذ ہے۔ اس نے بھی اپنی تلاش و جستجو کے دوران رحیم کی ہندی شاعری پر کسی طرح کے شبہ کا اظہار نہیں کیا ہے۔ جب تک کوئی معاصر سند اس کے برعکس حاصل نہیں ہوجاتی، ہم رحیم سے منسوب موجودہ ہندی کلام اسی کی تصنیف ماننے پر مجبور ہیں۔

عبدالرحیم خانخاناں تیرہ برس کا تھا کہ اپنے مربی اکبر اعظم کے ہمراہ گجرات کی مہم پر روانہ ہوا۔ بعد میں گجرات کی جنگ کی کمان آزادانہ اس کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے بعد سندھ میں جنگجوئی کا موقع ملا اور پھر دکن کے سلاطین سے معرکہ آرائی میں مصروف ہوگیا جہاں اس نے اپنی زندگی کے تیس قیمتی سال گزارے۔ بہتر سال کی عمر میں بھی جب اس کی زندگی کی شام تھی وہ مہابت خاں کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف نظر آتا ہے اور میدان جنگ میں ہی اس کا پیغام اجل آپہنچا۔

ان جنگوں کی داستان بڑی پُرپیچ ہے۔ کبھی کبھی جنگ کی بھول بھلیوں میں رحیم کا چہرہ گم ہوتا نظر آتا ہے۔ فتح و شکست کی ان کہانیوں میں رحیم کے اصل رول کو اجاگر کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ رحیم سے متعلق اکثر اردو، ہندی اور انگریزی کی کتابوں میں اس کا یہ رول واضح نہیں ہوتا۔ میں نے اس کمی کو بھی پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

رحیم کے عقیدہ کے بارے میں بھی تصدیق نہیں ہے۔ کوئی ایسی ہم عصر شہادت نہیں ملتی جس کی بنیاد پر حتمی طور پر کہا جاسکے وہ شیعہ تھا تاہم وہ ایک شیعہ

قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ کئی مصنفین نے اس کی تصدیق کی ہے۔ دکن میں اس کا طرز عمل بھی اس کے شیعہ ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

رحیم کے شیعی مسلک اور ہندی کوی ہونے کے بارے میں غیر جانب دارانہ رویہ اپنایا گیا ہے۔ یہ کتاب تاریخی ہے۔ مطالعہ سے جو حقائق سامنے آئے وہ اپنی زبان میں لکھ دیے ہیں۔ جو حوالے ضروری تھے ان میں کوئی بددیانتی نہیں کی گئی ہے۔ البتہ پیشہ ورانہ تحقیق کی چاشنی نہیں ہے۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ تاہم کتاب کئی پہلوؤں سے اہمیت کی حامل ہے۔ پہلا اڈیشن اس کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ جو ایک سال میں ختم ہوگیا۔ ایک مختصر اور بامعنی کتابیات دے دی گئی اس کے علاوہ کتاب کے اخیر میں حاشیے بھی ہیں جن میں معلومات کے علاوہ حوالہ جات بھی دے دیے ہیں۔ مغل عہد کی 15 خوبصورت تصویروں سے کتاب مزین ہے۔


شیخ سلیم احمد

۱۵۰۔ بستی حضرت نظام الدین

نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۱۳

۲۷/ جولائی ۱۹۹۰ء

# تہذیبی پسِ منظر

عبدالرحیم خانخاناں مغلوں سے نسلی اور خاندانی رشتہ رکھتے تھے۔ فارسی ادب میں 'مغل' لفظ کا مطلب تیموری ہے نہ کہ منگول۔ جہاں تک نسلی اصطلاح کا تعلق ہے مغل وہ خانہ بدوش، زراعت پیشہ لوگ تھے جو مشرق وسطیٰ اور عظیم تر ایران کے رہنے والے تھے اور ترکی اور فارسی زبانیں بولتے تھے۔ دوسرے معنوں میں مغل کا مطلب اس مغل خاندان سے ہے جو ایک ہی سیاسی مقصد سے وابستہ تھے ایک ہی خطہ میں رہتے تھے۔ اور جس نے ایک برادری کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

بابر اپنے باپ کی جانب سے تیمور کی پانچویں نسل میں تھا اور ماں کی طرف سے چنگیز خاں کا چودھواں جانشین۔ وہ چغتائی ترک تھا، اس لیے کہ اس کا آبائی وطن چغتائی خاں کی جاگیر میں تھا۔وہ ان کے گھرانہ کا ایک فرد تھا۔ اس لیے مغلوں کی تہذیبی میراث میں ان کا بھی حصہ تھا۔ ایک ہی تہذیب کے پروردہ ہونے کی وجہ سے، رحیم بھی مغلوں کے طرز فکر میں رنگے تھے۔ اور انہیں اپنے عہد کی ایک بہترین نمائندہ شخصیت کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ رحیم کو سمجھنے کے لیے مغلوں کے تہذیبی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

وسط ایشیا کی دو عظیم شخصیتوں چنگیز خاں اور تیمور لنگ کی خاندانی خصوصیات مغلوں کو ورثہ مین ملی تھیں، منگولوں نے اگرچہ اسلام قبول کرلیا تھا لیکن ان کے یہاں اسلام کی جڑیں بہت گہری نہیں تھیں۔ وہ اپنے قبائلی رسم و رواج کے پابند تھے اور سیکولر طرز فکر رکھتے تھے۔ آزادیٔ فکر کے حامی تھے۔ جستجو اور مہم جوئی

ان کی فطرت تھی۔ وہ کسی خاص عقیدہ سے بندھ کر رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ پیگنزم ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ چنگیز خاں نے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ وہ ایک ظالم اور خونخوار حکمراں تھا۔ انسانی جانوں کا دشمن تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ اعلیٰ درجہ کی انسانی خوبیوں کا بھی حامل تھا۔ بدھ مذہب کی اصطلاح میں اسے شمن (Shaman) کہا جاتا تھا جس کا مطلب تھا سادھو۔ وہ خدا پر یقین رکھتا تھا۔ مگر رسم و رواج میں نہیں۔ دوسرے مذاہب کا احترام کرتا تھا۔ کعبہ کی زیارت کے لیے جانا اسے پسند نہیں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ تمام دنیا خدا کا گھر ہے اور عبادت کہیں بھی کیجئے اس تک پہنچ جاتی ہے۔ منگول رواداری، انصاف اور نظم و ضبط کو پسند کرتے تھے۔ وہ علم و ادب کا ذوق بھی رکھتے تھے اور عالموں اور دانشوروں کی سرپرستی کرتے تھے۔ ان کی فوج میں ہر فرقے کے لوگ ملازم تھے۔ ہلاکو خاں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی لیکن حضرت علیؓ کے مزار کو چھوا تک نہیں بلکہ اس کی حفاظت کی۔

چنگیز خاں کے پوتے قبلا خاں یا قبلائی خاں نے 1269ء میں روم کے پوپ کے پاس ایک مشن بھیجا تھا اور یہ درخواست کی تھی کہ عیسائی علما اس کے دربار میں بھیج دیے جائیں تاکہ وہ ان سے استفادہ کریں اور مشرق و مغرب میں دوستی قائم ہو سکے۔ مگر چونکہ پاپائیت اپنے اندرونی انتشار کا شکار تھی اس لیے عیسائی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے ورنہ تو آج تمام منگول عیسائی ہوتے۔ یہ قبلا خاں تھا جس نے تمام مذاہب کی ایک کونسل بلائی تاکہ وہ ان کی بہترین تعلیمات سے واقف ہو سکے۔ بدھ، عیسائی اور مسلمان بھی اس کونسل میں شریک ہوتے تھے۔

اسی طرح کی کونسل اشوک اعظم نے بلائی تھی اور جب اکبر اعظم نے عبادت خانہ قائم کیا تو وہ اپنے اجداد کی روایت کو ہی زندہ کر رہا تھا۔ سچائی کی یہ جستجو اکبر کو ورثہ میں ملی تھی۔ یہ کہنا بھی درست ہے کہ منگول اگر اسلام قبول کرنے سے پہلے ہندستان آئے ہوتے تو ہندو مذہب اختیار کر لیتے۔ انہیں ایک مذہب کی

ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی وہ گئے وہاں کا مذہب اختیار کر لیا۔ چین میں بدھ مذہب کے پیروکار بن گئے۔ وسط ایشیا میں مسلمان ترکوں کے تعلق میں آئے اور اسلام قبول کرلیا۔ روس کے یوکرین علاقہ میں ان کا سابقہ عیسائیوں سے پڑا تو وہ عیسائی ہوگئے۔ گو نظریاتی طور پر انہوں نے کوئی نہ کوئی مذہب قبول کر لیا تھا تاہم ان کی پیگن خصوصیات۔ آزادیٔ فکر۔ رواداری، انصاف پسندی، روحانی اوررومانی مزاج اور علم و ہنر سے وابستگی ان کی شخصیت کا حصہ بنی رہیں۔

تیمور لنگ کا مغلوں سے دادھیالی اور چنگیز خاں سے ننھیالی رشتہ تھا۔ تیمور ترک تھا مگر اس نے چغتاں خاں کے خاندان میں مرزا حسن کی بیوہ سے شادی کر کے چغتائی قبیلہ سے نسلی رشتہ استوار کرلیا تھا۔ ماوراء النہر کے مشرقی اور مغربی دونوں کناروں پر آباد یہ دونوں عظیم قبیلے باہمی طور پر ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق میں بندھے تھے جو ایک دوسرے سے برسرپیکار بھی رہتے تھے۔[1] اور منگولوں کی طرح چغتائی ترک بھی اسلام قبول کرنے سے پیشتر پیگن (لامذہب) تھے۔ اسلام قبول کرنے کے باوجود وہ اپنے قبائلی طریقوں پر قائم رہے۔ تیمور ایک عظیم فاتح تھا اور پورا یورپ اس سے ڈرتا تھا۔ لیکن وہ ایک صوفی منش انسان تھا۔ جنگوں کے دوران درویش اس کے ساتھ ہوتے جن سے وہ شام میں پندو نصائح سنتا تھا۔ کیمپوں میں شعر و شاعری کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ یہ لوگ خود بھی شعر کہتے تھے اور کتابوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ تیمور راتوں میں کتابیں پڑھوا کر سنتا تھا۔ وہ سُنّی مذہب کے ماننے والے تھے لیکن سیاسی مصلحتوں اور ضرورتوں کی وجہ سے اہل تشیع کے ساتھ سمجھوتے کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس لیے شیعی اثرات ان پر غالب رہے۔ بابر اور ہمایوں دونوں اپنے سیاسی اقتدار کے لیے اہل تشیع کے مرہون منت تھے۔ شراب نوشی ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ بابر چاندنی راتوں میں حوض شراب سے بھر لیتا تھا اور یہ شعر گنگناتا۔

نوروز و نوبہار، مئے ومیرے خوشت
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

تیمور اپنے خطوں میں خود کو ''بندۂ خدا'' لکھتا اور وہ اپنے کو زمین پر خدا کا نمائندہ سمجھتا تھا۔ خلیفہ اور کعبہ جیسے مرکزی اسلامی اداروں کا اس کے دل میں کم ہی احترام تھا۔

چنگیز اور تیموری منگولوں کے یہ وارث جو مغل کہلاتے ہیں جب ہندستان آئے تو اسلام قبول کیے ہوئے ان پر دو سو سال کی مدّت بیت چکی تھی۔ اپنی اسلامی خصوصیات کے ساتھ وہ بہت سے علاقائی رسم و رواج اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے۔ ان کے عادات و اطوار اسلام سے زیادہ ایران اور ترکستان کے علاقائی رنگوں میں رنگے ہوئے تھے۔ ادھر ہندستان میں اسلام کو آئے ساڑھے چار سو سال بیت چکے تھے اور ہندستانی ماحول میں اسلام بہت سی تبدیلیوں سے گزر چکا تھا۔ ہندو مسلم تہذیبوں کا باہمی لین دین ہر شعبہ زندگی میں نمایاں نظر آتا تھا۔

ہندستانی فضا میں اب اسلام اجنبی نہیں رہ گیا تھا۔ مختلف فرقوں کے ایک ساتھ مل کر رہنے سے ایک ملی جلی تہذیب کے آثار نمایاں ہورہے تھے۔ صوفی سنتوں کی تعلیمات کے زیر اثر ایک مشترکہ تہذیب جنم لے رہی تھی اور ہندوستان کے مختلف خطوں میں نئی بولیاں فروغ پارہی تھیں۔

لسانی سطح پر جو تجربے ہورہے تھے وہ بڑے اہم تھے اور ان سے تہذیبی ہم آہنگی میں بڑی مدد مل رہی تھی۔ فارسی سرکاری زبان تھی۔ قلعہ کے اندر ابھی بھی ترکی بولی جاتی تھی۔ لیکن عوام میں برج بھاشا کا رواج بڑھ رہا تھا جو ہندی اور ہندوی کہلاتی تھی۔ شہزادے، امراء اور خود بادشاہ کو بھی اس زبان سے لگاؤ تھا اور فیشن کے طور پر بولتے تھے۔ دسویں و گیارہویں صدی میں خواجہ مسعود سعد سلمان جس زبان میں شاعری کررہا تھا اور تیروہویں صدی میں جسے امیر خسرو نے نکھارا اور سنوارا اور ہندوی نام دیا، وہ زبان پندرہویں و سولہویں صدی میں تخلیقی اظہار کا

اہم ذریعہ بن چکی تھی۔ اسی زبان میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں۔ مُلّا داؤد نے چندائن لکھی۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی (ردولوی) اسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ الکھداس تخلص تھا۔ رشدنامہ ان کے دوہوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی خانقاہ میں ہر صبح پرانیام (یوگا) ہوتا تھا۔ یہ سب مسلمان صوفی تھے۔ بلند پایہ عالم تھے۔ شریعت کے پابند لیکن ان کی شاعری میں بھگتی کے عناصر بھی شامل تھے۔ متذکرہ مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب وتمدن اور رسم و رواج کی زندہ تصویریں ملتی ہیں۔ بھی مثنویوں کا موضوع جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے ہندو کہانیاں ہیں۔ مثنوی کی ترتیب اس طرح ہے کہ حمد سے آغاز ہوتا ہے۔ پھر حضرت محمدؐ پیغمبر اسلام کی مدح ہے۔ اس کے بعد خلفائے راشدین ۔ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کی تعریف ہے اور پھر اپنے مرشد کی تعریف میں کچھ بند لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد بادشاہ وقت کی شان کی مدح ہے۔ اور اصل قصہ شروع ہوتا ہے جس کے دوران ہندستانی رسم و رواج جغرافیہ اور تاریخ کا بھی ذکر ہے۔

اُدھر بھگتی تحریک بھی ایک مشترکہ قومی تہذیب کے فروغ میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ کبیر اور نانک کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔ داد ودیال اور رحیم، چیتنیہ، تلسی داس اور سور داس بھگتی تحریک کے اہم رکن تھے۔ یہ لوگ تھے جو محبت، رواداری، انسانیت دوستی، اور مذہب کی روحانی قدروں کو فروغ دے رہے تھے۔ یہ تحریک صرف ہندی زبان یا شمالی ہند تک محدود نہ تھی بلکہ ملک گیر تھی۔ دکن میں دکنی، بنگال میں بنگالی، مشرق میں اودھی، مہاراشٹر میں کوکنی یا دکنی، راجستھان میں راجستھانی، سندھ میں سندھی، گجرات میں گجراتی زبانوں کا فروغ ہو رہا تھا اور ان میں مسلمان صوفی اور ہندو بھگت اعلیٰ پایہ کا ادب تخلیق کر رہے تھے۔

مرکز کے علاوہ ہندستان کے دور دراز صوبوں میں بھی ایک مشترکہ قومی کلچر پروان چڑھ رہا تھا۔ بلکہ اشتراک و امتزاج کا عمل صوبوں میں زیادہ تیز تھا اور اس کا رنگ زیادہ گہرا تھا۔ دلّی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوجانے پر بہت سے صوبوں

میں مسلمان صوبے داروں اور جاگیرداروں نے آزاد اور خودمختار حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ ان ریاستوں کے حکمراں اور درباری زیادہ مقامی مسلمان تھے اور جو غیر ملکی تھے وہ بھی شادی بیاہ کے ذریعہ علاقائیت کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ انہیں عوام کی حمایت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب مغلوں نے ان مسلم ریاستوں پر حملہ کیا اور انہیں اپنی مملکت میں ملانا چاہا تو مغلوں کو زبردست مزاحمت اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سندھ ہو یا گجرات یا دکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو سپاہیوں اور عوام نے اپنے مسلمان آقاؤں کے لیے مغلوں کے حملوں کے خلاف جان کی بازی لگا دی۔ سندھ میں مرزا جانی، گجرات میں مظفر گجراتی، دکن میں ملک عنبر اور چاند بی بی نے مغلوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ مغلوں کو ان مقامی سورماؤں کے خلاف مہم جوئی میں پے درپے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دکن کا بیشتر حصہ تو اخیر تک فتح نہ ہوسکا۔ مغل ان حکمرانوں کی مزاحمت کو بغاوتوں اور سرکشیوں کا نام دیتے تھے جبکہ دراصل یہ عوامی تحریکیں تھیں اور ان کے لیڈر عوامی لیڈر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ متذکرہ جاں باز پیہم شکستوں کے باوجود بار بار اپنی طاقت مجتمع کر کے مقابلے کے لیے صف آرا ہوجاتے تھے۔ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اس انتشار سے ہندو فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت قائم نہیں کرتے۔ کیوں کہ مذہبی امتیاز اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ہندو مسلمان حکمرانوں کو غیر ملکی نہیں سمجھتے تھے۔ بہمنی سلطنت پر محمود گاوان کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں مل کر لڑے۔ تیمور کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر مورچہ لیا۔ ہندو چاہتے تو یہاں اپنی حکومت قائم کرسکتے تھے۔ ہیمو بقال نے تو اپنے سوری آقا (عادل شاہ) کے لیے مغل سلطنت کا تختہ ہی اُلٹ دیا تا۔ اگر بیرم خاں بروقت مداخلت نہ کرتا تو آج ہندستان کی تاریخ دوسری طرح لکھی جاتی۔

ان صوبائی حکمرانوں کی سرپرستی میں مقامی کلچر اور زبان کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ مشترکہ کلچر کی چھاپ وہاں کے ادب، فن تعمیر، مصوری رقص و موسیقی اور رہن سہن میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس عہد کے فن تعمیر کو دیکھنے سے اندازہ ہوجاتا

ہے کہ مقامی عناصر باہر سے آئے تمدن پر کس طرح اثر انداز ہو رہے تھے اور مقامی ماحول کس طرح غیر ملکی اثرات قبول کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گجرات کا فن تعمیر دکن کے فن تعمیر سے مختلف ہے اور جون پور کا فن تعمیر سندھ کے فن تعمیر سے مختلف اور مرکز اپنا ہی جداگانہ رنگ رکھتا ہے۔ یہی تنوع موسیقی اور سنگ تراشی میں ملیگا۔

اکبر اور جہانگیر کے عہد کو ہندستانی سماج کی نشاۃ ثانیہ کا عہد کہا جاسکتا ہے جس میں مذہبی رواداری، تہذیبی ولسانی ہم آہنگی اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اکبر جیسی شخصیت اچانک پیدا نہیں ہوجایا کرتی۔ وہ اپنے عہد کا پروردہ تھا۔ صدیوں کی تہذیبی خصوصیات اس میں سمٹ آئی تھیں۔ اس نے اپنی سیاسی بصیرت سے اُبھرتی ہوئی نئی طاقتوں کو مزید منظم کیا اور انہیں نئی طاقت عطا کی۔ رحیم بھی اسی ماحول کا پروردہ تھا۔

اکبر اگرچہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر وہ ایک صوفی منش انسان تھا۔ تنہائی پسند، غور وفکر میں ڈوبا رہنے والا، رات رات بھر عبادت کرتا تھا۔ وسیع النظر اور فراخ دل تھا۔ وہ مزاجاً دروں بیں تھا۔ یا ھو یا ھادی کا وظیفہ پڑھتا تھا۔ مذہبی کٹرپن اس میں نام کو بھی نہیں تھا۔ انتظامی امور میں بھی اس کے فیصلے ہندو مسلم کی بنیاد پر نہیں ہوتے تھے بلکہ صحیح یا غلط اس کا پیمانہ تھا ہندو اور شیعی اثرات بھی اس نے قبول کر لیے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ سُنّی تھا اور اس کی ابتدائی زندگی میں کٹر سنی علما کا بڑا عمل دخل رہا۔ وہ ذہنی ارتقاء کی کئی منزلوں سے گزرا ہے۔ ابتدا میں وہ انتظامی امور میں کٹر سنی علما کے فیصلوں کو نظر انداز اور ان کے اثر سے اپنے کو آزاد نہیں کر سکا۔ یہ علما کئی بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ مغلوں کے زمانہ میں صدر، قاضی، میر منصف اور مفتی کے عہدے خاص اہمیت کے حامل تھے اور ان پر علما کا ہی تقرر کیا جاسکتا تھا اور وہ بھی سُنّی علما کا۔ چونکہ اکثریت کا مسلک یہی تھا۔

اکبر نے شیخ عبدالنبی کو صدر الصدور کا عہدہ دیا تھا۔ انہیں وزیرِ مذہبی امور سمجھنا چاہیے۔ وہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے نواسے تھے جو ہندی کے بھی کوی

تھے۔ عوام و خاص پر ان کے علم کی دھاک تھی۔ ابتدائی زندگی میں تصوّف کی جانب مائل تھے۔ لیکن بعد میں احادیث کی جانب زیادہ رجحان ہوگیا۔ اس کی وجہ شاید عربوں سے ان کا تعلق تھا کیوں کہ یہ تبدیلی ان میں کئی حج کرنے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ ان کی غیر معمولی قوت وطاقت کا راز ان کا عہدہ تھا۔ اوقاف ان کے انتظام میں تھے۔ اس لیے جو مدد معاش یا سیور غال کے بھی انچارج تھے۔ بادشاہ جس کو نقد روپیہ دیتا تھا اسے وظیفہ کہتے تھے لیکن یہ مدد اگر زمین کی صورت میں ہوتی تو اسے سیور الغال یا مدد معاش کہا جاتا تھا۔ سیور الغال کی تقسیم کا کام صدر کے ذمہ تھا۔ اسی لیے عبدالنبی کے دروازہ پر علما وفضلا۔ دانشوروں ارضرورتمندوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ انہوں نے بڑی فراخدلی سے زمینیں تقسیم کیں۔ اسی لیے ان کے اثر ورسوخ کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔

بادشاہ پر بھی شیخ عبدالنبی کا بہت اثر تھا۔ ان کی تعلیمات کے زیر اثر اکبر مسجد میں جھاڑو لگاتا۔ اذان دیتا اور نماز پڑھاتا تھا۔ شیخ مجلس سے اُٹھ کر جاتے تو بادشاہ انہیں جوتے لاکر پہناتا تھا۔ ایک بار تخت نشینی کی سالگرہ کے موقعہ پر بادشاہ کپڑوں پر زعفرانی رنگ چھڑک کر دربار میں آیا تو شیخ نے اسے تنبیہہ کی اور اپنی چھڑی سے بادشاہ کے کپڑوں پر ضرب لگائی۔ بادشاہ کو غصہ آیا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ البتہ بعد میں ماں سے شیخ کی شکایت کی۔ ماں نے بیٹے سے کہا: ”بیٹا! دل چھوٹا مت کر۔ یہ واقعہ تیری نجات کا باعث بنے گا۔ اس کے علاوہ قیامت تک اس بات کا چرچا رہے گا کہ ایک معمولی آدمی نے بادشاہ کی شان میں گستاخی کی اور بادشاہ پھر بھی خاموش رہا۔“

لیکن شیخ بہت جلد بادشاہ کی نظروں سے گر گئے۔ ان پر کئی طرح کے الزامات عائد ہوئے۔ کئی واقعات ایسے ہوئے جن کی وجہ سے بادشاہ ان سے ناراض ہوگیا۔ متھرا میں ایک برہمن تھا جس کے بارے میں یہ شکایت آئی کہ اس نے زیرتعمیر مسجد کا ملبہ چرا لیا اور پیغمبر اسلام کی شان میں بھی گستاخی کی۔ شیخ نے

برہمن کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اسے گرفتار کر کے دربار میں لایا گیا۔ شیخ نے فیصلہ سنایا کہ برہمن کو پھانسی دے دی جائے۔ جرم اتنا سنگین نہیں تھا۔ اس فیصلہ سے دربار میں بے چینی پھیلی ۔ بادشاہ خود بھی اس فیصلہ کے حق میں نہیں تھا۔ بیگمات بھی پھانسی کے خلاف تھیں۔ اور انہوں نے بادشاہ سے سفارش بھی کی کہ برہمن کو چھوڑ دیا جائے۔ لیکن شیخ اپنے فیصلہ پر اٹل رہے اور فیصلہ کے جواز میں بادشاہ کو دس حدیثیں سنائیں۔ اکبر نے عبدالقادر بدایونی سے رجوع کیا۔ بدایونی نے کہا کہ برہمن کو شک کا فائدہ دے کر رہا کیا جا سکتا ہے اور اس کے جواز میں ایک حدیث بھی پڑھ کر سنا دی لیکن شیخ اپنے فیصلہ کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوا اور بادشاہ کی مرضی کے خلاف برہمن کو پھانسی دے دی گئی۔

ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ اکبر اپنے بارے میں کثرت ازدواج پر شریعت کی مہر لگانا چاہتا تھا۔ اکبر شرعی احکامات کے مطابق زندگی گزارنا پسند کرتا تھا۔ اس لیے اس نے چاہا کہ زائد ازواج کے لئے شرعی جواز حاصل کیا جائے۔ وہ پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے شراب پینا بھی ترک کر دیا تھا۔ پیتا بھی تھا تو بہت کم۔ ایک سے زائد شادیوں کے سلسلہ میں اکبر نے شیخ سے فتویٰ طلب کیا۔ شیخ نے کہا بادشاہ کو چار سے زائد شادیاں کرنے کی بھی شرعی اجازت ہے۔ لیکن عبادت خانہ کے ایک مذہبی مذاکرہ کے دوران شیخ عبدالنبی نے کہا کہ اسلام میں بادشاہ کو چار سے زائد شادیاں کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ سن کر بادشاہ بہت ملول ہوا۔ اس نے شکایت کی کہ دیکھو شیخ کے فتویٰ کی وجہ سے میں گناہ کا مرتکب ہوا۔

شیخ پر یہ بھی الزام تھا کہ انہوں نے اپنے عہدہ کا ناجائز استعمال کیا تھا اور خود بہت سا روپیہ غبن کیا تھا۔ بادشاہ نے بہت سا روپیہ حج کے موقع پر غربا میں تقسیم کرنے کے لیے شیخ کو دیا تھا۔ انہوں نے اس کا بھی حساب ٹھیک سے نہیں دیا۔ شاید ان الزامات میں مبالغہ زیادہ ہو۔ ان کو بدنام کرنے کی بھی سازش کام کر رہی تھی۔ کہا جاتا ہے حساب کتاب کے معاملہ میں وہ بے پروا زیادہ تھے۔ ان کا

طریقہ کار بھی غیر رسمی تھا۔ ان کی ان کمزوریوں سے ان کے ماتحت عملہ نے فائدہ اٹھایا اور بدنامی حضرت شیخ کے کھاتہ میں لکھی گئی۔ لیکن ان کے خلاف الزامات کی تاریخی شہادت موجود ہے۔

اکبر کے دربار کے ایک اور عالم مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری تھے۔ جو مفتی اعظم تھے۔ وہ بھی عوام میں مقبول تھے اور بادشاہ پر بھی ان کا اثر تھا۔ سوری سلطان سلیم شاہ کے دربار میں انہیں شیخ الاسلام کا عہدہ دیا گیا تھا۔ سلطان انہیں اپنے برابر تخت پر بٹھاتا تھا۔ ہمایوں نے انہیں مخدوم الملک کا خطاب دیا تھا۔ عبدالنبی اور عبداللہ سلطان پوری دونوں عبادت خانہ کی مذہبی بحثوں میں سنی نقطہ نظر کی نمائندگی کرتے تھے۔ عبداللہ سلطان پوری پر بھی الزام تھا کہ انہوں نے اپنے درباری منصب سے ناجائز فائدہ اٹھا کر غیر معمولی دولت جمع کر لی تھی۔ انہوں نے حج کے خلاف فتویٰ دیا تھا کیوں کہ مکہ کے لیے سمندر سے سفر فرنگیوں کے جہازوں میں کرنا پڑتا تھا۔ اگر خشکی کے راستہ سے سفر کیا جاتا تو شیعوں کی سرزمین سے ہو کر گزرنا ہوتا تھا۔ اس لیے انہوں نے حج کرنا ناجائز قرار دے دیا تھا۔ عبادت خانہ کی بحثوں کے دوران اُن پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔ سال ختم ہونے سے پہلے اپنی ساری دولت بیوی کے نام پر منتقل کر دیتے ہیں اور دوسرا سال شروع ہونے پر اپنے نام کر لیتے اور اس طرح زکوٰۃ نہ دینے کا شرعی جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ مخدوم الملک نے ہندستان کو دار الکفر قرار دے دیا۔ اس کے علاوہ نہایت خودسر اور مغرور تھے۔ نماز کا وقت ہو جاتا تو بھرے دربار میں وضو کرتے اور جان بوجھ کر درباریوں پر پانی کی چھینٹیں اُڑاتے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ شیخ عبدالنبی اور عبد اللہ سلطانپوری دونوں ایک ہی مسلک سے تعلق رکھنے کے باوجود آپس میں لڑتے رہتے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں لگے رہتے۔ ان کے باہمی جھگڑوں سے بھی اکبر ان دونوں سے متنفر ہو گیا۔ آخر دونوں کو معزول کر دیا گیا اور جلا وطن کر کے مکہ بھیج دیا گیا۔

بعد میں جب عبداللہ سلطان پوری کی املاک کی تفتیش کی گئی تو ان کے خاندانی قبرستان سے سونے کی سلّیاں برآمد ہوئیں جو قبروں میں چھپا کر رکھی تھیں۔

اکبر کے دربار میں زیادہ تر سُنّی علما کا رویّہ کٹ حُجّتی پر مبنی تھا۔ وہ جھوٹی شان اور ریاکاری میں مبتلا تھے۔ روایت پرست اور لکیر کے فقیر تھے۔ ان کا طرزِ عمل اخلاق اور تہذیب سے گرا ہوا تھا۔ اکبر حق کا جویا، کھلے ذہن کا مالک، وسیع المشرب، آزادیٔ فکر کا حامل، علما کی اس تنگ نظری سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ہوا بھی یہی وہ بڑے اخلاص سے سنّی علما کی جانب بڑھا تھا مگر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ دھیرے دھیرے سنّی علما کے طبقہ سے دور ہوتا چلا گیا۔ سنّی علما کی کٹ حُجّتی کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے۔

اس زمانہ میں مہدویوں کو خارج از اسلام تصور کیا جاتا تھا۔ سیکڑوں مہدویوں کو علما کے فتویٰ پر قتل کیا گیا۔ اکبر کے عبادت خانہ کا ایک منظر ہے۔ بادشاہ کے سامنے مہدویوں کے خلاف مقدمہ پیش ہے۔ مصطفیٰ گجراتی [2] بادشاہ سے کہتے ہیں۔ ''مہدوی شیخ سے بحث کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ ہمارے لیے مکہ کے عالموں کا فیصلہ کافی ہے ان کا فتویٰ مہدوی شیخ کو پھانسی پر چڑھانے کی مضبوط دلیل ہے۔

بادشاہ نے اس حقیر (مصطفیٰ گجراتی) سے پوچھا:

''کیا مکہ کے علما گجرات آتے تھے؟'' حقیر نے جواب دیا

''نہیں۔''

اس پر بادشاہ بولا:

''کیا وہ (عرب علما) مہدویوں کے بارے میں جانتے ہیں۔''

حقیر نے جواب دیا:

''نہیں۔ وہ ان کے بارے میں نہیں جانتے ہیں۔''

بادشاہ نے حیرانی سے کہا:

"کیسے عجیب لوگ (عرب کے علما) ہیں انہوں نے مہدویوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور ان کے خلاف محض مہدویوں کے دشمنوں کی شکایت پر فتویٰ جاری کردیا۔ سچے عالموں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

بادشاہ کی اس تقریر پر موجود علما ایک آواز ہو کر بولے۔

"اے مرزا! (بادشاہ) ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ مکّہ کے علما کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں، ہمارے لیے ان کا فتویٰ کافی ہے۔"

یہ سُن کر بادشاہ بہت برہم ہوا اور ایک عالم دین سے جو مجلس میں موجود تھا، مخاطب ہوا:

"اے محترم! ایک مرتبہ تم نے مجھے بتلایا تھا کہ تمہارے والد مکہ میں درس دیتے تھے اور وہاں انہوں نے بڑی عزت حاصل کی تھی لیکن دشمنوں نے ان کی شہرت سے جل کر ان پر رافضی ہونے کا الزام لگایا اور عرب کے علما نے ان کے خلاف فتوی جاری کر کے انہیں مروا دیا تھا۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ ان پر جھوٹا الزام لگایا گیا تھا اور تمہارے والد بے قصور تھے کیا تم علما کے اس فتوے کو صحیح سمجھتے تھے۔" اس عالم کے پاس بادشاہ کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا مگر وہ پھر بھی بولے اور کہا "حضور! اگر آپ منافق اور بے دین لوگوں کے سامنے علمائے حق کو اس طرح ذلیل کریں گے تو پھر کوئی بھی ان کی عزت نہیں کرے گا۔"

بادشاہ نے جواب دیا:

''اس عالمانہ محفل میں یہ احمقانہ جواب ہے۔ جب مکہ کے علما
دشمنوں کے کہنے پر تمہارے والد کے خلاف فتوئی جاری کر سکتے ہیں
تو کیا وہ ایسا مہدویوں کے خلاف نہیں کر سکتے؟''
عالم دین خاموش ہو گیا۔

اس طرح کے واقعات نے اکبر کو سنّی علما سے دور کر دیا۔ خود سنّی علما پر جس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسلام کی خدمت کا بہترین موقع انہیں ملا تھا جو انہوں نے گنوا دیا۔ اکبر کو ایک وسیع ترافق کی تلاش تھی۔ اس کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا اس خلا کو اثنا عشری نے پُر کیا۔ اکبر نے بچپن سے شیعی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ بیرم خاں جو شیعہ تھا اس کا اتالیق تھا۔ ابتدائی ایام حکومت میں بیرم خاں ہی اس کا وکیل سلطنت یعنی وزیر اعظم تھا۔ بیرم خاں کی بیوہ اس کے نکاح میں تھی۔ چنانچہ اکبر نے اپنے دو بیٹوں کے نام حسن اور حسین رکھے جو بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ اگرچہ مغل سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ایران کے زیر اثر آئے تھے جہاں ایک شیعہ حکومت تھی مگر بعد میں شیعہ مذہب مغلوں کی ضرورت بن گیا۔ تقلید پرستی کے برخلاف یہ عقل پرستی کا دور تھا۔ مذہبی امور میں جو شک و شبہ پیدا ہوتا تھا اس کا جواب دلیل سے دیا جاتا تھا۔ ایک متجسس ذہن مطمئن ہونا چاہتا تھا۔ شیعی حضرات اپنی تعلیم و تربیت اور اپنے تہذیبی ورثہ کے پیش نظر اس عہد کے لیے موزوں ترین لوگ تھے۔ وہ آزادئ فکر کے حامل تھے۔ بات کو سلیقہ سے پیش کرنا جانتے تھے۔ سب سے بڑھ کر اہل اقتدار حضرات کی تعریف و توصیف کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

شیخ مبارک جو شیعہ تھے[3] اکبر کے دربار میں گجرات کی فتح کے جشن کے موقع پر حاضر ہوتے ہیں۔ بادشاہ سے پہلا تعارف ہے۔ صاحب کمال لوگوں کو اظہار خیال کا موقع حاصل ہے۔ اس موقع پر شیخ مبارک بھی تقریر کرتے ہیں۔ بولتے کیا ہیں بلکہ محفل کو لوٹ لیتے ہیں۔ گجرات کی فتح پر مبارکباد پیش کرتے

ہوئے شیخ مبارک تجویز پیش کرتے ہیں کہ بادشاہ عوام کا روحانی پیشوا اور حاکم دونوں بن سکتا ہے۔ وہ امام اور سلطان دونوں کا رول ادا کرسکتا ہے۔ شیخ نے اکبر کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ یہی تو وہ چاہتا تھا۔ دربار واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اکبر نے شیخ کو گلے سے لگا لیا۔ یہ وہی شیخ مبارک تھا جس کو عبدالنبی ،اورعبداللہ سلطانپوری نے مہدوی ہونے کا الزام لگا کر پھانسی لگانے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس نے بادشاہ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر اس کا دل جیت لیا تھا۔ چھ سال بعد محضر نامہ کی شکل میں اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ یہ واقعہ سنگ میل ثابت ہوا۔ اس محضرنامہ سے اکبر نے روایت پرست کٹر علما سے نجات حاصل کرلی۔ بادشاہ خلیفۂ وقت بن گیا۔

اکبر جب سنّی علما سے بدظن ہوا تو اس نے شیعی علما کو بلایا جن میں تین بھائی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حکیم ابوالفتح، حکیم ہمایوں اور حکیم نورالدین جنہیں جیلان سے بلایا گیا تھا۔ اکبر خاص طور پر حکیم ابوالفتح سے بہت متاثر ہوا چونکہ بادشاہ جو کچھ کہتا تھا نہ صرف یہ کہ ابوالفتح اس کی تائید کرتا تھا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر بادشاہ کے دل کی بات کہتا تھا۔ چنانچہ اس نے بادشاہ کا دل جیت لیا اور اس کا قریب ترین مصاحب بن گیا۔ اکبر نے قرآن کی تفسیر لکھنے کا حکم دیا۔ ابوالفضل (شیخ مبارک کا بیٹا) تھا۔ آیۃ الکرسی کی تفسیر لے کر دربار میں حاضر ہوا۔ شیخ مبارک اور ان کے دونوں بیٹوں (فیضی و ابوالفضل) کی وجہ سے دربار کے ماحول میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی۔ انہوں نے سلطنت کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔اکبر کے اندر کا صوفی اور مدبّر اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اور بقول آر۔ایس ترپاٹھی مغل حکومت محض سیاسی نہ رہ کر ایک تہذیبی سلطنت میں تبدیل ہوگئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملی جُلی اس تہذیب کے پیچھے محرک کیا تھا۔ کون سا اصول اور نظریہ اس کے پیچھے کام کر رہا تھا۔ دراصل یہ اک نظریاتی تحریک تھی۔

صوفی سنت جس کے مبلغ تھے اور جس نے نظریۂ وحدت الوجود کے بطن سے جنم لیا تھا اور جس کا بنیادی اصول تھا کہ سچائی تو ایک ہوسکتی ہے مگر اس تک پہنچنے کے راستے مختلف ہوتے ہیں جس نے یہ سکھایا کہ انسان نہیں بلکہ اس کے گناہ سے نفرت کرو۔اسلام میں صوفیوں کا یہ مسلک پہلی انقلابی تحریک تھی جس نے کل عالم انسانیت سے پیار کرنا سکھایا۔جس نے دلوں کو ملانے کا کام کیا۔ اسلام کے دوست اور ہمدرد پیدا کیے۔ اس تحریک کی وجہ سے اسلامی فکر دو دھاروں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک دھارا روایت پرست راسخ العقیدہ مسلمانوں کا تھا تو دوسرا دھارا وجودیوں کا تھا جو آزادی فکر کے حامل تھے۔ ایک اہل شریعت کہلائے تو دوسرے اہل طریقت۔ ایک اہل ظاہر تھے تو دوسرے اہل باطن۔ اور دونوں دھاروں کے ماننے والوں میں برابر کشمکش ہوتی رہتی تھی۔ یہ کشمکش عہد مغلیہ میں بھی نظر آتی ہے اور آج بھی ہے۔ اکبر نے وجودی قوتوں کا ساتھ دے کر تہذیبی جذب و انجذاب کے عمل کر تیز تر کر دیا تھا۔ چنانچہ اس تحریک کے نتیجہ میں متحدہ قومی تہذیب اپنے عروج پر پہنچ گئی جس کی جھلکیاں ہمیں اس عہد کے فنون لطیفہ، طرز معاشرت اور زبان و ادب میں صاف نظر آتی ہیں۔مولانا شبلی نے اکبر کے عہد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ''(اکبر کی) ان کارروائیوں نے متعصب مولویوں کا زور توڑ دیا تھا اور اکبر کو موقع ملا کہ وہ ایک ایسی وسیع اور آزادانہ حکومت قائم کرے جس کے سایہ میں ہندو، مسلمان، یہود و نصاریٰ آزادی کے ساتھ اپنے اپنے فرائض مذہبی ادا کریں۔ اور یہی طرز حکومت خلفائے راشدین نے قائم یا تھا۔''

یہ ثابت ہوتا ہے کہ مغل دور حکومت میں اصل قوت چاہے وہ اسلام ہو یا ہندو ازم مذہب نہیں تھا بلکہ زبان اور کلچر زیادہ طاقتور محرکات تھے جو سماج میں کام کر رہے تھے۔ آج بھی یہی صورت حال ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی زبان

اور خطہ زمین سے زیادہ گہرا لگاؤ رکھتا ہے۔ اگر مذہب اصل طاقت ہوتی تو اکبر اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف جنگی کاروائی نہ کرتا۔ تیمور لنگ کا حملہ بھی ایک مسلم حکومت پر تھا۔ مسلمان آقاؤں کی ہدایت پر ہندو سپہ سالار ہندو ریاستوں کے خلاف نبرد آزما نظر آتے ہیں اور ہندو آقا کے ایما پر مسلمان فوجیں، مسلمانوں سے ہی لڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

عہد مغلیہ کے زوال کے ساتھ صلح کل کی یہ تحریک کمزور پڑگئی۔ اور رجعت پسند اور روایت پرست طاقتوں نے پھر سر اُبھارا۔ سیاسی زوال کا شاید یہ لازمی نتیجہ تھا۔ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو بحال کرنے کے لئے پھر پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہتے تھے۔ یہ انکی مجبوری تھی۔ وہ تاریخ کے دھارے کو موڑ نہ سکے۔ تاریخ نے یہ ثابت کیا ہے کہ پیچھے کی طرف لوٹ جانے کی اس حکمت عملی سے مسلمانوں کو نقصان ہی پہونچا۔ فائدہ کچھ بھی نہ ہوا۔ اٹھارہویں صدی اور بعد کے آنے والے مذہبی پیشواؤں کی تعلیمات کے نتیجہ میں مسلمانوں میں بنیاد پرستی پختہ ہوگئی اور مشترکہ تہذیب کا دھارا اُلٹ ضرور گیااور شہودی قوتوں کو ہمیشہ کی طرح سماج میں اعتبار اور اقتدار میں مرتبہ حاصل رہا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وجودی فکر جو سیکڑوں سالوں پر محیط صوفی سنتوں کی کاوشوں سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا جز بن گئی تھی، اپنی تابناکی اور توانائی کے ساتھ چمکدار موتیوں کی جگمگاتی رہی، آج بھی جگمگا رہی ہے اور ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔

اس کتاب میں جہاں عبدالرحیم خانخاناں کی جنگی اور سیاسی کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے وہاں ان مشترکہ تہذیبی اور سیکولر تصویروں کو بھی جگہ جگہ ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ جو اس عہد کا طرۂ امتیاز تھیں۔ اس کتاب کا مقصد بھی ان مشترکہ قدروں کی بازیافت ہی ہے اور انہیں مزید توانا بنانا ہے۔

☆☆

# بیرم خاں

عبدالرحیم خانخاناں بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ ان کے والد بیرم خاں کا شمار سلطنت مغلیہ کے معماروں میں سے ہوتا تھا۔ ہمایوں کی ہندوستان واپسی اور مغل سلطنت کا استحکام بیرم خاں کا ہی رہین منت تھا۔ ہمایوں کے خلاف افغانوں کی بغاوتوں کو کچلنے میں بیرم خاں نے اہم رول ادا کیا۔

بیرم خاں ترکوں کی قراقونیلوشاخ سے تعلق رکھتا تھا۔علی شکر بیگ قرا قونیلو ترکوں کے بہارلو قبیلہ کا سردار تھا۔ بیرم خاں اس کی پانچویں پیڑھی میں تھے۔ قراقونیلو ترکوں نے پندرہویں صدی کے نصف اول میں ایران و مقدونیہ کی سیاست میں ممتاز رول ادا کیا تھا۔ وہ اقتدار کی بلندی پر تھے۔ ان کے اقتدار کی بنیاد قرا محمد نے رکھی تھی جو بیرم خواجہ کا بھتیجا تھا۔ بیرم خواجہ جلائرید سلطان اویس کے دربار میں اہم منصب پر فائز تھا۔ قرا محمد جو سلطان اویس کے بیٹے سلطان احمد کے دربار سے وابستہ تھا قراقونیلو ترکوں کا سردار بن گیا۔اس نے آرمینیہ میں اپنی آزدانہ حکومت قائم کر لی۔ تیمور کے ایک عہدہ دار کو گرفتار کر کے تبریز کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔ ۱۳۹۰ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کا بیٹا قرایوسف اس کا جانشین ہوا۔ اگر چہ وہ بھی باپ کی طرح کافی طاقت ور تھا مگر تیمور کے سامنے ٹک نہیں سکا۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا اور مصر کے مملوک سلطان کے یہاں پناہ لی جس نے تیمور کے خوف سے اسے قیدی بنا لیا۔ تیمور کے انتقال کے بعد قارا یوسف کو آزدی ملی اور وہ اپنے وفادار سپاہیوں کے ساتھ جو صرف ایک ہزار تھے اپنے وطن لوٹ آیا۔

اب اس نے پھر سے اپنی طاقت مجتمع کرنا شروع کی اور تیموری شہزادے مرزا ابوبکر کو دوبار جنگ میں شکست دی۔ دوسری جنگ میں جو اپریل 1408ء میں وقوع پذیر ہوئی مرزا ابوبکر کا باپ میراں شاہ مارا گیا۔ قرایوسف نے اس طرح آذربائیجان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس وقت جب وہ ایک کے بعد ایک علاقے فتح کر رہا تھا 1420ء میں ایک بیماری سے اس کا انتقال ہوگیا۔

قرایوسف کے بعد اس کا بڑا بیٹا امیر اسکندرہ جانشین ہوا مگر اس بار تیمور کے بیٹے و ولی عہد شاہ رخ نے اسے ہرا کر بھاگنے پر مجبور کیا۔ اس کا بھائی جہاں شاہ تیموری شہزادے سے جا ملا۔ اور دونوں نے مل کر اس کی طاقت کو ختم کر دیا۔

جہاں شاہ نے ایک بار پھر قراقونیلو پرچم کو لہرایا اور ان کی طاقت کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ وہ ایک بڑی سلطنت کا حکمراں بن گیا جس میں عراق، عجم، فارس، کرمان، عمان (ہرمز) اور خراساں شامل تھے۔ اسے بعد میں تیموری سلطان ابوسعید کو خراسان واپس کرنا پڑا۔ مگر پھر بھی بلا شرکت غیرے ایک بڑا علاقہ اس کی حکمرانی میں آگیا۔ قراقونیلو کا قومی جھنڈا ''کالی بھیڑ'' ایران سے لے کر عراق تک لہلہانے لگا۔

جہاں شاہ نے قراقونیلو کو اقتدار کی بلندی پر پہنچا دیا تھا مگر یہیں سے ان کے انحطاط کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ حریف قبیلہ آق قونلو ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اوزون حسن باندری اس قبیلہ کا طاقت ور سردار تھا جس نے جہاں شاہ کو بری طرح شکست دی۔ وہ جنگ میں مارا گیا۔ اسی کے ساتھ ان کی طاقت منتشر ہوگئی۔ اب بیرم خان کے جد اعلیٰ علی شکر بیگ کا ستارہ چمکتا ہے۔ مختصراً ان کے اجداد کا ذکر کیا جاتا ہے۔

## علی شکر بیگ

علی شکر بیگ بہارلو قبیلے کا ممتاز سردار تھا اور مرزا جہاں شاہ کے دربار کا

اہم درباری اور اس کا معتمد تھا۔ مرزا جہاں شاہ کے ماتحت اس نے اہم جنگی مہمات فتح کیں اور سلطنت کا دائرہ وسیع کیا۔ ایک بڑے علاقہ پر اس کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ آخرکار آقان قونولو قبیلے کے سردار اوزن حسن نے مرزا جہاں شاہ کو ہرا دیا اور وہ جنگ میں مارا گیا۔ علی شکر بیگ آزاد و خود مختار بادشاہ بن گیا۔ اس نے آقونولو قبیلے کے خلاف کئی جنگیں لڑیں اور تیموری حکمراں مرزا ابوسعید کی طاقت کو بھی کمزور کر دیا شومئی قسمت جب وہ شہرت و طاقت کی بلندی پر تھا، اوزن حسن کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ اس نے چھ سات سال حکومت کی ہوگی۔

## پیر علی بیگ

علی شکر بیگ کی موت کے بعد اس کا بیٹا پیر علی بیگ اس کا جانشین بنا۔ وہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا اور اس نے قراقونیلو قبیلے کے وقار و اقتدار کو بحال کیا۔ وہ اپنے دو بھائیوں کے ساتھ تیموری سلطان ابوسعید سے جا ملا تاکہ اپنے حریف اوزن حسن بیگ کو شکست دے سکے جو آقونولو قبیلہ کا طاقت ور سردار تھا۔ پیر علی بیگ کو حسن بیگ کے ہاتھوں کئی شکستوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ فرار ہوگیا۔ حسن بیگ کے حملوں سے تنگ آکر پیر علی سلطان ابوسعید کے بیٹے سلطان محمود کی پناہ میں آگیا۔ پیر علی بیگ کی بہن پاشا بیگم کی شادی سلطان محمود سے ہوئی تھی۔ پاشا بیگم کی اولاد میں ایک بیٹا سمرقند کے تخت پر بھی بیٹھا تھا۔ اور اس کی ایک بیٹی سے بابر نے شادی کی تھی۔ اس طرح پاشا بیگم کے ذریعہ بیرم خاں تیموری خاندان سے خاندانی اعتبار سے منسلک ہوئے۔ پیر علی بیگ نے خود بھی قراسکندر کی ایک بیٹی سے شادی کی تھی اور بیرم خاں کا دادا یار علی بیگ کو مرزا جہاں شاہ کے وارثوں میں شمار کرتا تھا۔

پیر علی بیگ کی پوری عمر جنگوں میں گذری۔ اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس

کے بعد اس کے بڑے بیٹے یار علی بیگ نے اس کی پس ماندہ و بچی کچی فوج کی کمان سنبھالی۔

## یار علی بیگ

یار علی بیگ کا نام بیرک بیگ بھی تھا۔ بابرنامہ میں کئی جگہ اس کا نام یار علی اور یار علی بلال لکھا ہے۔ لیکن مآثر رحیمی میں بیرک بیگ ہی کے نام سے ذکر آیا ہے۔ یار علی بیگ اپنے چچا بدخشان کے سلطان محمود مرزا کے پاس چلا گیا جہاں گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم ہوا۔ خلعت و جاگیر عطا ہوئی۔ یار علی کو دربار میں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوگیا۔ سلطان محمود کی موت کے بعد یار علی خسرو شاہ کے دربار میں داخل ہوا۔ مگر خسرو شاہ کی نوکری چھوڑ کر یار علی نے اپنے بیٹے سیف علی (بیرم کا باپ) کے ساتھ بابر کی نوکری کر لی۔ تزک بابری میں کئی مقامات پر اس کا ذکر موجود ہے۔ اسے غزنی کا صوبہ دار بھی بنایا گیا۔ کہا جاتا ہے یار علی کا انتقال بابر کی نوکری کے زمانہ میں، بابر کے ہندستان پر حملہ کرنے سے پہلے ہوگیا تھا۔

## سیف علی

سیف علی اپنے باپ کے ساتھ بدخشاں آیا تھا۔ اس نے سلطان محمود اور جہاں شاہ کے درباروں میں نوکریاں کیں۔ وہ اولوالعزم سپاہی تھا۔ ایران میں صفویوں کی بڑھتی طاقت کے پیش نظر اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ اس نے بابر کی ملازمت اختیار کر لی اور غزنی کی صوبیداری بھی اسے تفویض کی گئی۔ کہا جاتا ہے بابرنامہ میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔

بیرم خاں، سیف علی بیگ کے بیٹے تھے۔ وہ بدخشاں میں قلعہ ظفر میں پیدا ہوا ان کی والدہ کا نام نکھی خانم تھا، نقشبندی خواجاؤں کے گھرانہ سے ان کا تعلق تھا۔ صوفی گھرانہ سے بیرم خاں کے ننھالی رشتہ کے اثرات اس کے بیٹے رحیم کی شخصیت میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ رحیم کی وسیع المشربی اور رواداری اسی رشتے کی دین ہے۔

# بیرم خاں اور مغل

بیرم خاں کے بچپن کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ اس کا بچپن بہت زیادہ عیش وعشرت میں نہیں گذرا کیوں کہ اس کے والد اور دادا دونوں کی زیادہ تر عمر اپنے خاندانی اقتدار کو بحال کرنے میں گذری۔ بیرم خاں کی پرورش بدخشاں میں اپنی پر پھوپھی پاشا بیگم کے زیر نگرانی ہوئی تاہم ان غیر یقینی حالات میں بھی اس کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ بیرم خاں نسلاً ترک تھا۔ خاندان تیموری سے بھی اس کا ننھیالی خاندانی رشتہ تھا۔ اکبرنامہ میں اس کا ننھیالی شجرۂ نسب بھی دیا ہے۔

اگرچہ بیرم خاں کے مذہب کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ وہ شیعہ تھا مگر عصری تواریخ سے اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے۔ تاہم وہ تفضیلی میلانات کا حامل ضرور تھا۔ (ہم نے اسے شیعہ ہی لکھا ہے)

مرزا علاء الدین کی بیوی شاہ بیگم محمود مرزا بن سلطان ابوسعید مرزا کی بیٹی تھی۔ شاہ بیگم چوتھی پشت میں علی شکر بیگ کی نواسی ہوتی ہے۔ کیونکہ علی شکر بیگ کی لڑکی، شاہ بیگم کے لڑکے شہزادہ محمود مرزا سے منسوب تھی اس رشتے کی رعایت سے بابر نے اپنی بیٹی گلرنگ بیگم مرزا نورالدین سے بیاہ دی تھی بیرم خاں علی شکر بیگ کی پانچویں پشت میں تھا (بیرم خاں بحوالہ اکبر نامہ ابوالفضل جلد دوم)

بیرم خاں بدخشاں میں پیدا ہوا اور وہیں اس کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ سولہ سال کی عمر سے وہ بابر سے وابستہ تھا۔ اپنی فطری ذہانت، محنت اور پسندیدہ اطوار کی

وجہ سے وہ بابر کا معتمد خاص بن گیا۔ شہزادہ ہمایوں بھی اس کے اوصاف سے متاثر تھا۔ بابر نے بیرم خاں کو اپنے بیٹے ہمایوں کا اتالیق مقرر کیا جس کی خواہش خود ہمایوں نے کی تھی۔

بیرم خاں ترقی کر کے سپہ سالار کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ گجرات کی مہم میں چمپانیر کو فتح کرنے میں بیرم خاں نے ہمایوں کی مدد کی۔ قنوج کی تاریخی جنگ میں جہاں سے ہمایوں کو شیر شاہ سے شکست کھا کر بھاگنا پڑا تھا، بیرم خاں بھی ساتھ تھا۔ اس جنگ میں وہ بہادری سے لڑا۔ شکست کے بعد اس نے سنبھل کے راجہ مترسین کے یہاں پناہ لی۔ مترسین ہمایوں کا باج گزار تھا۔ شیر شاہ نے راجہ سے کہا کہ وہ اسے بیرم خاں کو واپس کردے۔ مترسین انکار نہیں کر سکا اور بیرم خاں کو شیر شاہ کے حوالہ کر دیا۔ شیر شاہ اس کی بہادری کے قصے سن چکا تھا وہ اس کے ساتھ عزت سے پیش آیا۔ اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر بیرم خاں نے یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ اور وہاں سے نکل بھاگا۔ گوالیار کا گورنر ابوالقاسم اس کے ہمراہ تھا۔ راستہ میں شیر شاہ کی فوجوں نے انہیں گھیر لیا اور وہ دونوں گرفتار کر لیے گئے۔ ابوالقاسم بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ شیر شاہ کے افسروں نے اسے بیرم خاں سمجھ کر اس سے مخاطب ہوئے۔ مگر بیرم خاں نے کہا ''بیرم خاں وہ نہیں میں ہوں'' ابوالقاسم نے کہا ''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میرا وفادار ہے اور میری زندگی بچانا چاہتا ہے اس لیے اپنے کو بیرم خاں کہہ رہا ہے۔'' یہ سن کر افسروں نے ابوالقاسم کو قتل کر دیا۔ بیرم خاں فرار ہو کر گجرات کے سلطان محمود شاہ کے دربار میں پہنچا۔ وہاں سے وہ حج کے بہانہ سورت ہوتے ہوئے سندھ آگیا جہاں وہ ہمایوں کے ساتھ آملا۔ ایران کے سفر میں بھی بیرم خاں ہمایوں کا دمساز و رفیق تھا۔ ایران کا بادشاہ طہماسپ صفوی اس کی بہادری سے بہت متاثر ہوا اور اسے 'خان' کا خطاب عطا کیا۔

ایران سے واپسی پر ہمایوں نے افغانستان کو دوبارہ حاصل کیا اور بیرم

خاں نے اس کی اس مہم میں مدد کی اسی دوران ہمایوں نے اسے 'خانخاناں' کا خطاب دیا۔ ہمایوں نے بیرم خاں کو اپنے بھائی کامران کے خلاف مہم پر بھیجا۔ بیرم نے اس سے قندھار واپس لے لیا اور کابل کو فتح کرنے میں بھی مدد کی۔ بعد میں جب بیرم خاں کو قندھار کا گورنر مقرر کیا تو ہمایوں نے شاہ ایران کو لکھا کہ اسنے بیرم کو قندھار کا گورنر اس لیے مقررر کیا تھا کہ وہ ہم دونوں کا وفادار تھا۔ لوگوں نے شکایت کی کہ بیرم خاں غداری کر رہا ہے۔ وہ ایران سے ملا ہوا ہے۔ بعد میں ہمایوں نے چھان بین کی تو یہ الزام بے بنیاد پایا۔

۱۵۵۳ء میں ہمایوں تیرہ سال جلا وطن رہنے کے بعد دوبارہ ہندستان کے تخت پر بیٹھا۔ اس بار اس نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کی۔ ایران میں قیام کے دوران شاہ طہماسپ صفوی نے مشورہ دیا تھا کہ تم ہندستان میں اجنبی کی طرح رہتے ہو اس لیے تمہاری ہار ہوئی۔ مقامی زمینداروں اور راجاؤں سے تعلقات بڑھاؤ اور پٹھانوں کو تجارت میں لگاؤ۔ اس نے شاہ ایران کے مشوروں پر عمل کیا۔ ایک اہم قدم یہ اٹھایا کہ مقامی زمینداروں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کیے۔ میوات میں حسن خاں بڑا جاگیر دار تھا۔ جس کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ اس کا ایک چچازاد بھائی جمال خاں میواتی تھا جس کی دو خوبصورت بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی سے ہمایوں نے خود شادی کر لی اور ہمایوں کے اصررا پر چھوٹی بیٹی کی شادی بیرم خاں سے کر دی۔ عبدالرحیم خانخاناں اسی میواتی بیگم کا بیٹا تھا۔

شیر شاہ کے انتقال کے بعد افغانوں کی طاقت منتشر ہونے لگی تھی۔ مغلوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور بیرم خان نے ان کی بھرپور مدد کی۔ افغانوں اور مغلوں کے درمیان مچھی واڑہ (پنجاب) کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں بیرم خاں نے افغانوں کو ہرا دیا۔ انعام میں اسے سنبھل کی جاگیر ملی۔ پنجاب گوکہ مغلوں کے قبضہ میں تھا مگر وہاں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ مغلوں کا مقرر کردہ گورنر

شرارت پر آمادہ تھا۔ ہمایوں نے نوجوان شہزادہ اکبر کو پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ تو بچہ تھا اور برائے نام گورنر تھا۔ حقیقی طاقت بیرم خاں کے ہاتھ میں تھی جو اکبر کا اتالیق بھی تھا۔ پنجاب کی بدنظمی سے سکندر سوری فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اکبر اور بیرم خاں اس کی طاقت کو ختم کرنے میں مصروف تھے۔ مہمات کے دوران جب وہ گورداسپور کے کلانور مقام پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے تو ہمایوں دلّی میں حادثہ کا شکار ہوگیا وہ قلعہ کی لائبریری کی سیڑھیوں سے گر پڑا۔ چوٹ سر پر لگی تھی۔ چار دن تک اس پر بیہوشی طاری رہی۔ اور پانچویں دن اس کا انتقال ہوگیا۔ ہمایوں کے انتقال کی خبر سن کر امرا نے اکبر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ۱۴ر فروری ۱۵۵۶ء کو کلانور کے ایک باغ میں اس کی تاجپوشی کر دی گئی۔ اس وقت مغل سلطنت چاروں طرف خطروں سے گھری تھی۔ ہیمو نے اطراف دلّی پر قبضہ جما لیا تھا۔ ان خطرات کو دیکھتے ہوئے تاجپوشی کی اسی محفل میں بیرم خاں کو اتفاق رائے سے وکیل سلطنت یعنی وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ مغلوں کا اس سے زیادہ وفادار کوئی نہیں تھا۔

اکبر اور بیرم خاں دلّی کی طرف بڑھے۔ تھانیسر ہوتے ہوئے پانی پت کے تاریخی میدان میں پہنچے جہاں اکبر کا دادا بابر تیس سال پہلے ایک جنگ جیت چکا تھا اور باپ چند سال پہلے ایک جنگ ہار چکا تھا۔ یہاں ان کا مقابلہ ہیمو 3 سے ہوا جس کی فوج مغلوں سے کہیں زیادہ تھی۔ بیرم خاں نے ایک جوشیلی تقریر کی۔ اس نے کہا ''آج مغلوں کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔'' اس کی تقریر نے سپاہیوں کے دلوں کو امنگ اور حوصلہ سے بھر دیا۔ مگر ہیمو کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ مغلوں کے پاؤں اکھڑنے والے تھے۔ فیصلہ ہیمو کے حق میں ہونے والا تھا کہ اسی وقت ایک تیر ہیمو کی آنکھ میں لگا اور وہ زمین پر گر گیا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ مغلوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک ہاری ہوئی جنگ جیت گئے اور ہیمو کی بدقسمتی کہ وہ جیتی ہوئی جنگ ہار گیا۔ اس کے سپاہیوں نے بہت کوشش کی کہ اسے میدان جنگ سے لے جائیں مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

ہیمو کو اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔ بیرم خاں نے اکبر سے کہا کہ ہیمو کا سر اپنی تلوار سے قلم کر کے غازی کا درجہ حاصل کر لے مگر اکبر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ ایک زخمی انسان پر اپنی تلوار نہیں اٹھا سکتا۔ اس پر بیرم خاں نے خود ہی ہیمو کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔

اس دوران جو ایک اہم واقعہ پیش آیا وہ بیرم خاں کی شادی ہے۔ ہمایوں نے سلیمہ بیگم سے بیرم کا رشتہ طے کیا ہوا تھا۔ سلیمہ، گلرخ بیگم کی بیٹی تھی جو بابر کی بہن تھی۔ سلیمہ کو بعض مورخین بابر کی نواسی اور ہمایوں کی بھتیجی کہتے ہیں بعض ہمایوں کی بھانجی بہر حال اس کا نسب اس طرح ہے۔ سلیمہ سلطان بیگم بنت مرزا نورالدین ولد علاء الدین محمد ولد خواجہ حسین المعروف بہ خواجہ زداہ چغتائیان (یہ سب نقشبندی خواجگان سے تعلق رکھتے تھے)۔ سلیمہ کا باپ مرزا نورالدین بھی ہمایوں کا قریبی رشتہ دار تھا۔

بیرم خاں کے ساتھ سلیمہ بیگم کی شادی کو ٹالا جا رہا تھا کیوں کہ بیگمات اس رشتے کے خلاف تھیں کیوں کہ بیرم خاں شاہی گھرانہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ شادی کا محض وعدہ ہی تھا۔ اسی زمانہ میں بیگمات حرم کابل سے ہندستان آ گئی تھیں۔ اکبر لاہور سے دہلی کی جانب کوچ کر رہا تھا۔ جالندھر کے قریب یہ شاہی قافلہ خیمہ زن ہوا۔ بیرم خاں 4 نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر سے ہمایوں کے وعدہ کو یاد دلایا۔ اکبر نے منظوری دے دی اور بیرم خاں اور سلیمہ بیگم کی شادی بڑے دھوم دھام سے منائی گئی۔ اس کے بعد بیرم خاں اور اکبر کے درمیان تعلقات کشیدہ ہونے شروع ہو گئے۔ اب اکبر کی عمر اٹھارہ سال ہو گئی تھی اور وہ خود حکومت کرنا چاہتا تھا۔

اختلافات کو ہوا دینے میں اکبر کی دایا ماہم انگا 5 نے اہم رول ادا کیا۔ خود بیرم کی زیادتیوں کو بھی اس میں دخل تھا۔ اس نے بڑے بڑے ترک عہدہ داروں جیسے تردی بیگ اور محاسب خاں کو پھانسی دے دی۔ محمد شیروانی ناصر الملک

جو ایک مقبول امیر تھا اسے ہٹا کر اس کی جگہ ایک غیر معروف شخص کو مقرر کر دیا۔ شیخ گدائی کنبھو کو جو شیعہ تھا صدر الصدور مقرر کر دیا اور ایک مشہور سنّی صوفی محمد غوث کو ایذائیں پہنچاتا رہا۔ دربار کے سنّی امرا محسوس کرنے لگے کہ بیرم خاں اپنے ہم مسلک لوگوں کو فائدہ پہنچا رہا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ بیرم خاں نے بادشاہ کے دعویداروں کو نظر انداز کرتے ہوئے خود اپنے ہی رشتہ داروں کو اعلیٰ منصب دیدیے۔ اکبر کے حرم کا خرچ کم کر دیا۔ بیرم خاں پر یہ بھی الزام تھا کہ وہ اکثر بادشاہ کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتا تھا۔ ماہم انگا، اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو پسند نہیں کرتی تھی کیوں کہ وہ خود اپنے بیٹے ادھم خاں کو وزیر اعظم بنانا چاہتی تھی۔ یہ ایسی صورت حال تھی جس میں یا تو بادشاہ گھٹنے ٹیک دیتا یا بیرم خاں کو جانا پڑتا۔ آخرکار قسمت نے فیصلہ بیرم خاں کے خلاف کر دیا۔

حمیدہ بانو بیگم جو بادشاہ کی ماں تھی۔ ماہم انگا اور اس کا بیٹا ادھم خاں اور اس کا ایک عزیز شہاب الدین اتکا خاں نے جو دلّی کا گورنر بھی تھا مل کر بیرم خاں کے خلاف سازش کی۔ بیرم خاں فوج کا سپہ سالار تھا اور حرم پارٹی کو خوف تھا کہ اگر بیرم خاں کے خلاف کاروائی کی گئی تو شاید فوج میں بغاوت پھیل جائے۔ منصوبہ کے مطابق بادشاہ بیرم خاں سے اجازت لے کر شکار کے بہانہ آگرہ سے روانہ ہوا۔ سکندرہ پہنچنے پر ماہم انگا بھی وہاں پہنچ گئی اور بادشاہ سے کہا کہ وہ دلّی چلے۔ جہاں اس کی ماں سخت بیمار ہے۔ شہاب الدین اتکا خاں نے جو دلّی کا گورنر تھا۔ بادشاہ کا خیر مقدم کیا۔ سازش میں شریک سبھی امرا یہاں موجود تھے۔ بادشاہ نے دلّی سے بیرم خاں کو لکھا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ حج کے لئے روانہ ہو جائیں جس کی خواہش آپ اکثر کرتے رہے ہیں۔ اخراجات کا انتظام کر دیا جائے گا۔" اس کے بعد بیرم خاں اور اکبر کے درمیان مزید کچھ خط و کتابت ہوئی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ حرم سازش کامیاب ہوگئی۔ بیرم خاں کا بادشاہ سے تعلق منقطع ہوگیا۔ یہ خبر منصوبہ بند

طریقہ پر تمام جگہ پھیلا دی گئی۔ امرا جوق در جوق آگرہ سے دلّی میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔

بیرم خاں کے باقیماندہ حواریوں نے مشورہ دیا کہ مزاحمت کی جائے اور بادشاہ کے خلاف لڑا جائے۔ بیرم خاں نے مورچہ لیا لیکن وہ ہار گیا۔ بیرم خاں بادشاہ سے معافی مانگنے پر مجبور ہوا۔ اس نے حج پر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ میوات پہنچا۔ وہاں سے ناگر آیا۔ یہاں اس نے شاہی تمغے، وزارت عظمیٰ کا تمام ساز وسامان مہریں وغیرہ سب بادشاہ کو واپس بھجوا دیں۔ بادشاہ بڑا خوش ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بیرم خاں کے تمام وفاداروں نے راستہ ہی میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا جن میں شیخ گدائی بھی تھا اور جس کی وجہ سے خاص طور پر بیرم خاں پر عتاب نازل ہوا تھا۔ اس کے برخلاف ہندو راجاؤں جیسے رائے کلیان مل اور اس کے بیٹے رائے سنگھ نے جو اس علاقہ کے زمیندار تھے بیرم خاں کا شاندار استقبال کیا۔

مگر شاید حرم پارٹی کو یقین نہیں تھا کہ بیرم خاں اتنی آسانی سے ہار مان جائے گا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ وہ حملہ آور ہوگا۔ یا شاید اس لیے کہ اسے مزید سوچنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ اس کا پیچھا کرنے کے لئے ایک فوجی دستہ روانہ ہوا۔ پیر محمد خاں شیروانی جس کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ وہی پیر محمد خاں تھے جو بیرم خاں کے وفادار افسروں میں تھے۔ اس پر بیرم خاں کو غصہ آیا اور اسنے بھی ہتھیار اٹھا لیے۔ کچھ موقع پرستوں نے بھی ہوا دی ہوگی۔ بیرم خاں پنجاب کی جانب بڑھا۔ اپنی بیوی، بچوں جن میں اس کا بیٹا عبدالرحیم بھی تھا اور تمام ساز وسامان کو شیر محمد دیوانہ کے سپرد کیا جو اس کا وفادار تھا۔ دیوانہ نے بھی غداری کی۔ بیرم خاں کا ساز وسامان لوٹ لیا۔ بیگمات کی شان میں بھی گستاخی کی۔ بیرم خاں کو یہ دیکھ کر بڑا دُکھ ہوا۔ بیرم خاں نے جوابی حملہ کیا۔ دیوانہ نے بیرم کے خلاف بادشاہ کو رپورٹ بھیج دی۔ بادشاہ نے اتکا خاں کی قیادت میں ایک بڑی فوج بیرم خاں کے خلاف بھیجی۔ بیرم خاں ہار گیا اور اس نے شوالک پہاڑیوں میں پناہ لی۔ اس کے تمام

وفادار افسر بادشاہ کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ بادشاہ نے اس کا تمام ساز و سامان ضبط کر لیا۔ اس میں ایک بیش بہا علَم بھی تھا جس میں قیمتی ہیرے جواہرات جڑے تھے اور جو بیرم خاں امام رضا کے مزار پر چڑھانا چاہتا تھا۔ یہ علَم شاہی خزانہ میں داخل کر دیا گیا۔ بیرم خاں دریائے بیاس کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے قلعہ میں جا چھپا۔ اس جنگ میں اس کا ایک وفادار امیر سلطان حسین جلایر بھی مارا گیا۔ وہ غیر معمولی حسین و جمیل تھا۔ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا اور بہادر اور حوصلہ مند تھا جب اس کا کٹا ہوا سر بیرم خاں کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اپنا چہرہ رومال سے ڈھانپ لیا اور یہ کہتے ہوئے زار و قطار رونے لگا۔ "ہائے! افسوس صد افسوس، میری اپنی بدقسمتی کی وجہ سے ایسے ایسے کتنے نوجوان اس جنگ میں شہید ہو گئے۔" آخر کار بیرم خاں نے اپنے کو بادشاہ کے سپرد کر دیا۔

بیرم خاں نے معافی نامہ لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیجا۔ بادشاہ نے اسے معاف کر دیا۔ منعم خاں اور دوسرے امیروں کو اس کے پاس بھیجا کہ عزت و احترام کے ساتھ اسے لے کر آئیں۔ حاجی پور میں جہاں بادشاہ خیمہ زن تھا۔ بیرم خاں کی اپنے آقا سے ملاقات ہوئی۔ بڑا دلگداز منظر تھا۔ بیرم خاں قدموں میں گر گیا اور معافی مانگنے لگا۔ لیکن اکبر نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ تین باتوں میں سے اپنے لیے کسی ایک کو چُن لے۔ چندیری اور کالپی کے اضلاع بطور جاگیر لے لے اور آرام سے زندگی گذارے یا بادشاہ کی مصاحبت قبول کر لے یا پھر حج کے لئے چلا جائے۔ اس نے آخرالذکر پیش کش قبول کر لی اور حج کے لیے روانہ ہوا۔ چند روز اس نے منعم خاں کے ساتھ قیام کیا جو اب اس کی جگہ وزیر اعظم بن گیا تھا۔ منعم خاں اس کے ساتھ نہایت عزت سے پیش آیا۔ تمام ضروری ساز و سامان اور پیسہ فراہم کر دیا گیا۔ زاد سفر کے لیے پچاس ہزار روپیہ دیا گیا۔

بیرم خاں سرہند، ہانسی اور ارچھوتانہ ہوتا ہوا پٹن ۲؎ پہنچا جسے نہر والا یا انہل واڑہ بھی کہتے ہیں۔ پٹن گجرات کا قدیم دارالخلافہ تھا اور جس کا صوبیدار ایک افغان

موسیٰ خاں فولادی تھا۔ اس نے بھی بیرم خاں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ اس سفر میں اس کی بیوی (سلیمہ) اور بیٹا عبدالرحیم بھی اس کے ساتھ تھے۔ پٹن میں قیام کے دوران بیرم یہاں کی جھیلوں اور باغوں سے بہت لطف اندوز ہوا۔ ایک دن جنوری ۱۵۶۱ء میں وہ یہاں کی بڑی جزیرہ نما جھیل سہسہ لنگا تلاؤ میں سیر کر رہا تھا۔ جب وہ جھیل سے باہر آیا تو تیس چالیس پٹھانوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ خنجر اس کے سینہ میں پیوست کر دیا گیا اور وہ اسی وقت مر گیا۔ اس کی تاریخ وفات ''شہید شد محمد بیرم'' ہے۔ ایک پٹھان مبارک خاں لوہانی نے یہ حملہ کیا تھا کیونکہ اس کا باپ مچھی واڑہ کی جنگ میں بیرم خاں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ دوسرا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ بیرم خاں افغان سلطان سلیم شاہ کی بیوہ اور بیٹی کو اپنے ہمراہ لیے جا رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے عبدالرحیم کی شادی اس کی لڑکی سے کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات پٹھانوں کو ناگوار تھی۔ اس کے قتل کے بعد اس کے خیمہ کو لوٹ لیا گیا۔ اس کے بیوی بچے بڑی مشکل سے احمد آباد پہنچے۔ چند فقیروں نے اس کی لاش کو ایک صوفی شیخ حسام الدین کے مقبرہ کے قریب دفنا دیا۔

بابا زنبور اور دوسرے چند وفادار ملازم بیرم خاں کی بیوہ سلیمہ بیگم اور اس کے بیٹے عبدالرحیم کو جس کی عمر چار پانچ سال تھی بچانے میں کامیاب ہو گئے اور انہیں بحفاظت احمد آباد پہنچا دیا۔ وہاں سے اکبر نے انہیں اپنے پاس بلایا۔ رحیم کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

بیرم خاں ایک بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ مغلوں کے تئیں اس کی فوجی اور سیاسی خدمات کا ہم نے ذکر کیا۔ اسے قسمت کی ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ ایک معمار سلطنت کا انجام ایسا عبرتناک ہوا۔ اقتدار کی ہوس، مذہبی تعصب اور کچھ زیادتیاں شاید اس کے زوال کے اسباب تھے۔ تاہم اس کی وفاداری ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ وہ خود تو بادشاہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا مغل سلطنت اور اپنے آقا کے مفاد کے لئے کیا۔ انتظام اور نظم ونسق کے لئے سختی ناگزیر

ہوتی ہے۔ بیرم کو بھی سخت اقدامات کرنے پڑے۔ کسی حد تک مذہبی تعصب کا اس پر الزام عائد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے دوسرے کارناموں کو دیکھتے ہوئے یہ معمولی سی کمزوری جو انسانی فطرت ہے قابل معافی ہے۔

بیرم خاں ایک عالم، ادیب، شاعر اور درویش صفت انسان تھا۔ شاعری میں اس کے دو دیوان اس کے نام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ ایک فارسی اور دوسرا ترکی۔ وہ مذہبی انسان تھا اکثر اس پر حال کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ حضرت علیؓ کی شان میں اس نے کئی قصیدے تحریر کیے۔ ہمایوں کی تعریف میں بھی قصیدے لکھے۔ فنون لطیفہ سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ خاص طور پر شاعری سے شغف رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ ہاشم قندھاری کی ایک غزل اپنے نام سے منسوب کر لی۔ بعد میں شاعر کو ساٹھ ہزار ٹنکے معاوضہ دیا۔ ہاشم کی درخواست پر یہ معاوضہ بڑھا کر ایک لاکھ کر دیا۔ وہ موسیقی کا بھی دلدادہ تھا اور اسکا ایک اچھا پارکھ بھی۔ اس نے اپنے زمانے کے مشہور موسقار رام داس کو ایک لاکھ ٹنکا انعام میں دیے تھے۔

بذلہ سنجی اور خوش طبعی بھی بیرم کے مزاج کا حصہ تھی۔ ایک دفعہ ہمایوں بیرم سے گفتگو کر رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ بیرم باتیں سنتے سنتے اونگھنے لگا۔ بادشاہ نے خفا ہو کر کہا۔ "بیرم خاں! میں تجھ سے مخاطب ہوں اور تو ہے کہ سو رہا ہے۔" بیرم خاں نے برجستہ جواب دیا "حضور! میں ہمہ تن گوش ہوں ۔ میں نے سنا ہے کہ بادشاہوں کی صحبت میں نگاہوں پر قابو رکھنا چاہیے۔ درویشوں کی صحبت میں دل پر اور عالموں کی محفل میں زبان پر۔ حضور والا بادشاہ کے ساتھ ساتھ ایک درویش اور عالم بھی ہیں۔ میں سوچ یہ رہا تھا کہ میں کس چیز پر قابو رکھوں۔" بادشاہ اس جواب پر خوش ہوا۔

اپنے آقا کے تئیں وفاداری اور غیر معمولی ذہانت یہ دو خوبیاں بیرم خاں کو دوسرے امرا سے ممتاز کرتی ہیں۔ بیرم خاں کی ذہانت کا ایک اور واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

کامران حلف وفاداری اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ہمایوں کامران کو فرمان بھیجتا ہے اور اس کام کے لئے بیرم خاں کو منتخب کرتا ہے۔ بیرم خاں جانتا تھا کہ کامران بادشاہ کے فرمان کھڑے ہو کر وصول نہیں کرے گا چونکہ ایسا کرنے سے ہمایوں کے تئیں اس کی وفاداری ثابت ہو جائے گی۔ بیرم خاں جب فرمان لے کر اس کے حضور پہنچا تو پہلے اس نے قرآن حکیم کا ایک قلمی نسخہ اس کی خدمت میں پیش کیا جسے اس نے کھڑے ہو کر وصول کیا اور اسی وقت بادشاہ کے فرمان بھی اس کو دے دیے۔ یہ اس کی اطاعت قبول کرنے کا اشارہ تھا۔ امرا موجود ہیں۔ انھوں نے شہزادے کو کھڑے ہو کر فرمان وصول کرتے ہوئے دیکھا۔ کچھ سرکاری رسل و رسائل نے اس واقعہ کو ہوا دی۔ بات مشہور ہوگئی شہزادہ نے اطاعت قبول کر لی، اس طرح اس کی سرکشی کا زور ٹوٹ گیا۔

ہاشم قندھاری کی اس غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ کیجئے جو بیرم خاں نے اپنے نام سے منسوب کر لی تھی۔

من کیستم عنان دل از دست دادہ
وز دست دل؟ بہ راہ غم از یاد افتادہ
ہم چشم جاں بہ صورت جاناں کشودہ
ہم خون دل ز دیدۂ گریاں کشادہ
گاہے چو شمع ز آتش دل گرفتہ
گہہ چو فتیلہ بادل آتش فتادہ
بیرم ز فکر اندک و بسیار خارغم
ہرگز نگفتہ ایم کمی یا زیادۂ

بیرم خاں کی ایک غزل جو اس نے عہد جوانی میں کہی تھی اس کی فارسی شاعری کے نمونے کے طور پر نقل کی جاتی ہے۔

ہمیشہ دردو ملامت کشیدہ ام از تو
بلا و محنت بسیار دیدہ ام از تو

رسیدہ است بسی نامرادیم زرقیب
اگر دی بمرادی رسیدہ ام از تو
بہار حسن و جمالی ولی چہ سود کہ من
بعمر خود گل وصلی نچیدہ ام از تو
وفا و مہر تو ہرگز نمی رود ز دِلم
اگرچہ مہرو وفائی ندیدہ ام از تو
زبزم عیش و فراغت دمیدہ چوں بیرم
بکنج محنت و غم آرمیدہ ام از تو

☆☆
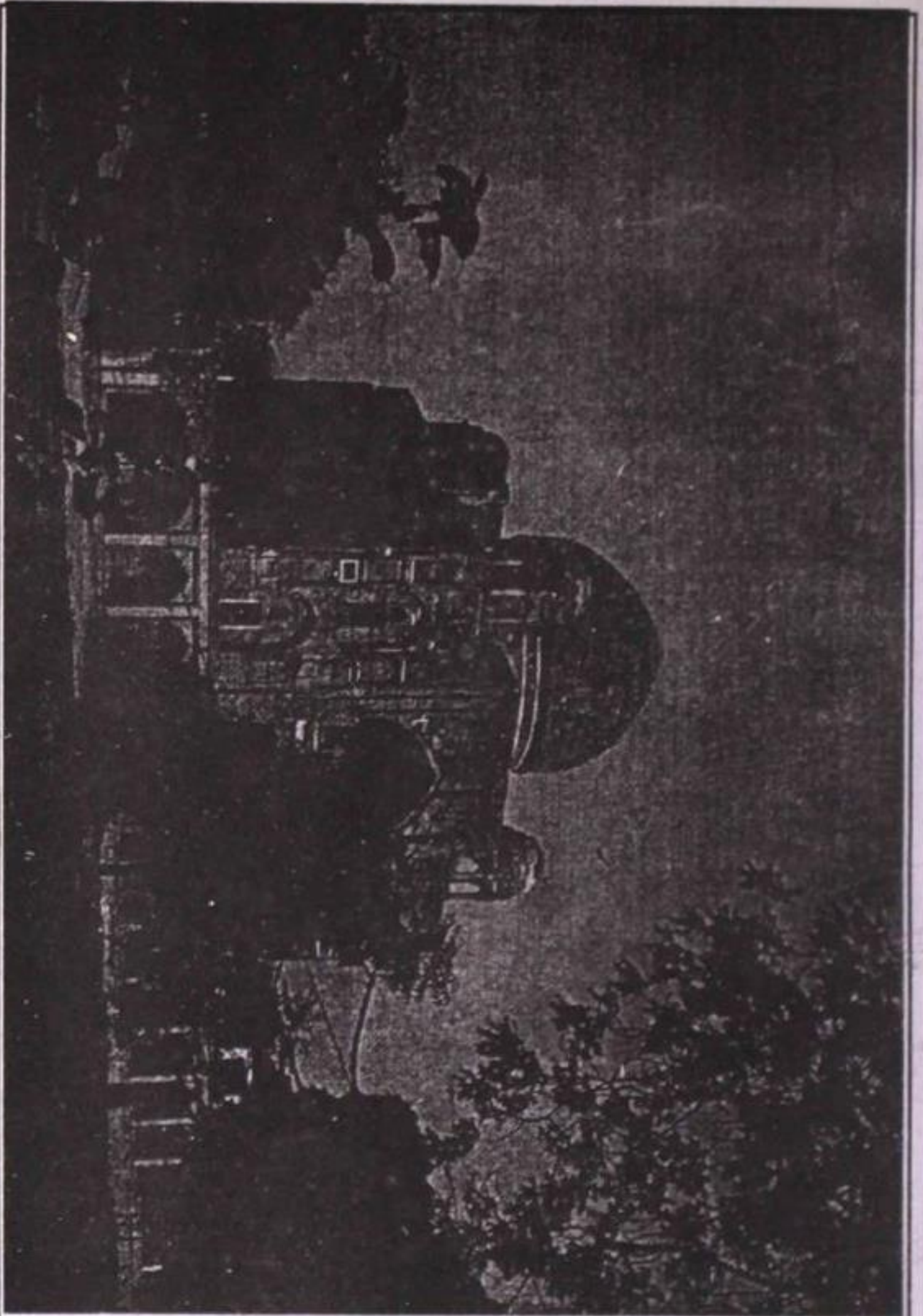
مقبرہ۔عبدالرحیم خانخاناں

اکبر اپنے مشیروں کے ساتھ۔ یہ تصویر اکبر کے آخری ایام کے معلوم ہوتی ہے۔ جس میں اکبر کے نورتن بیٹھے ہیں۔ بائیں جانب دوسرے نمبر پر مان سنگھ کو پہچانا جاسکتا ہے۔
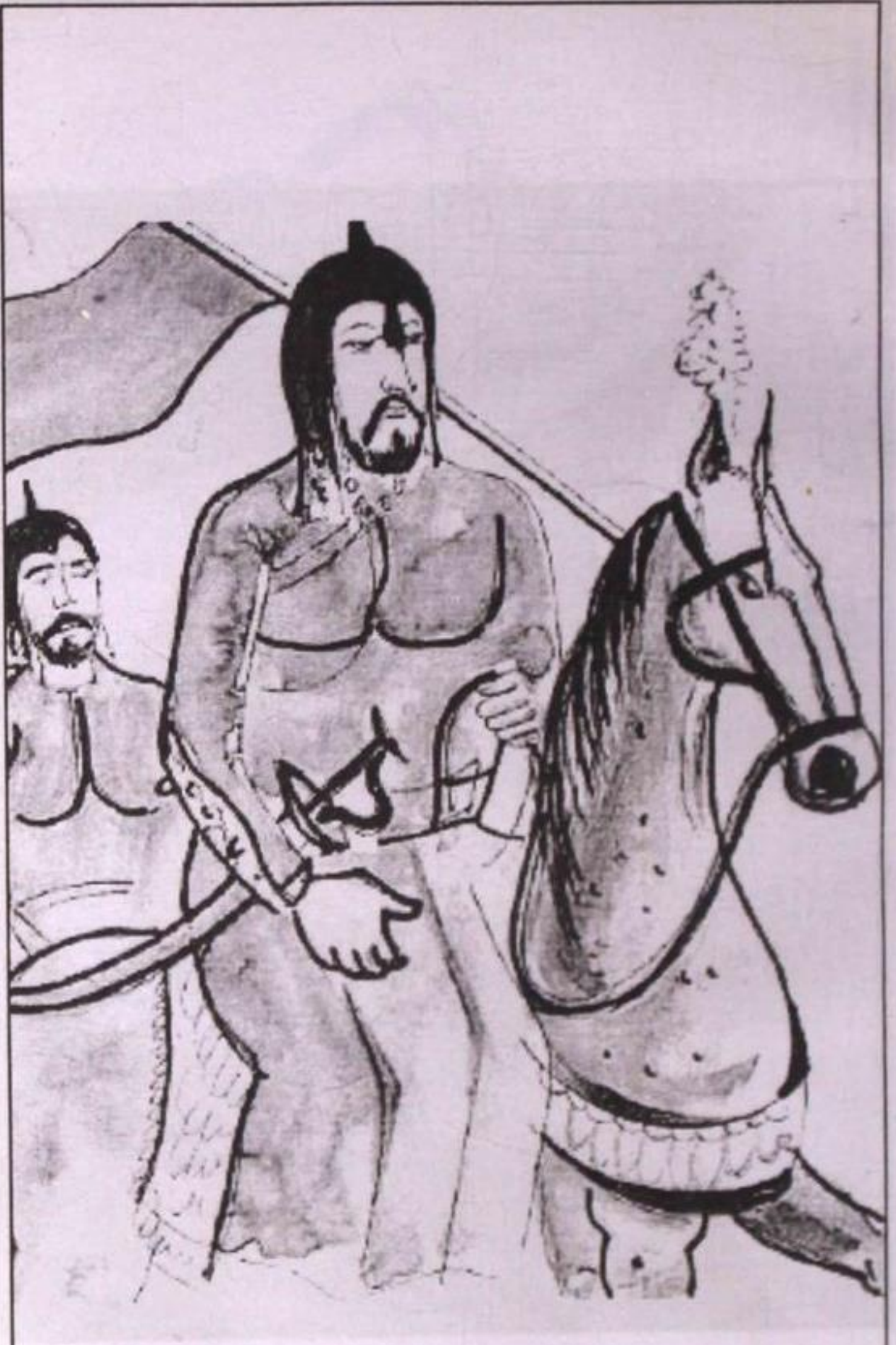
تیمور لنگ۔ مغلوں کے جدامجد

چنگیز خاں۔ مغلوں کے جدامجد
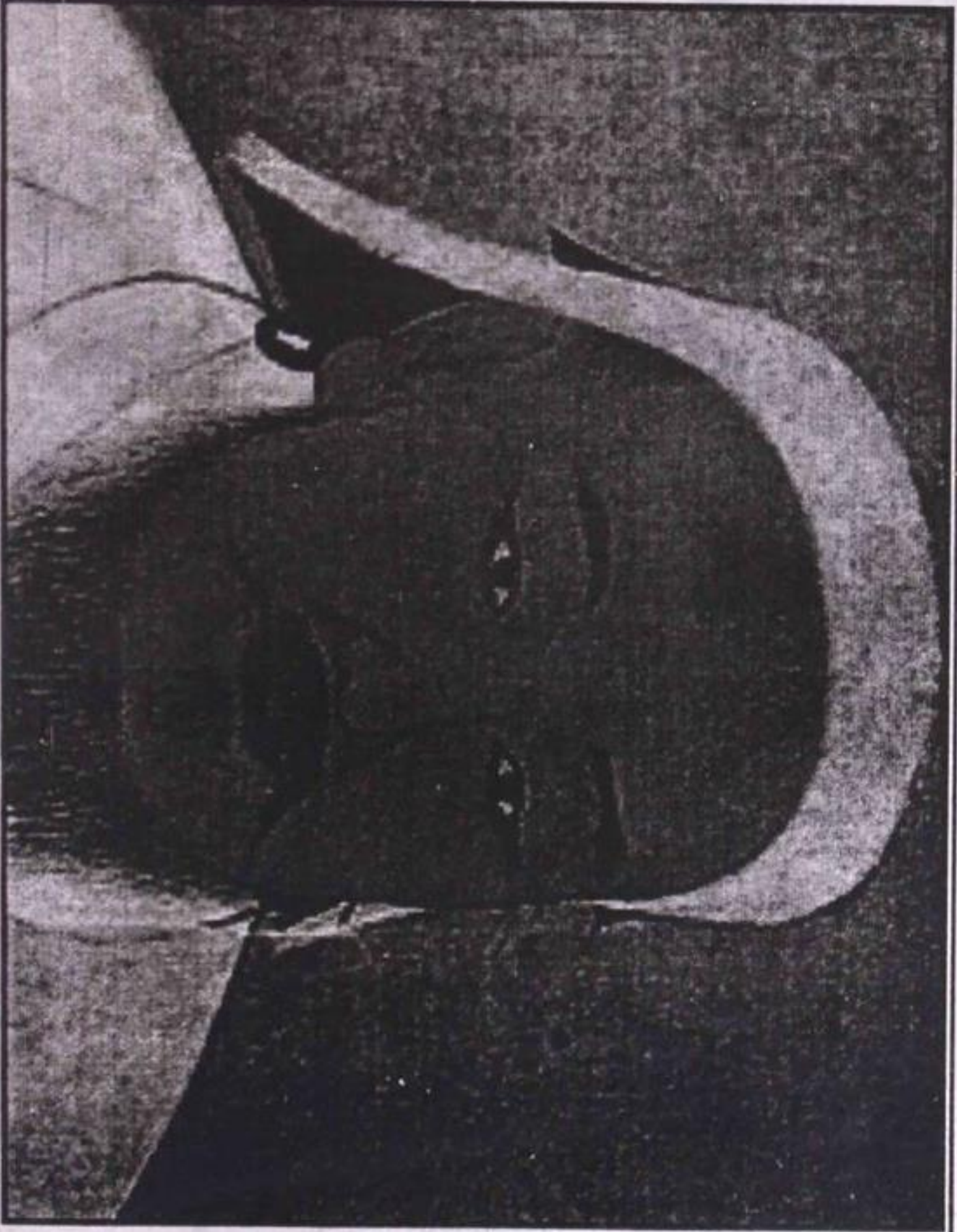
بیرم خاں

اکبرِ اعظم

جہانگیر

عبدالرحیم خانخاناں
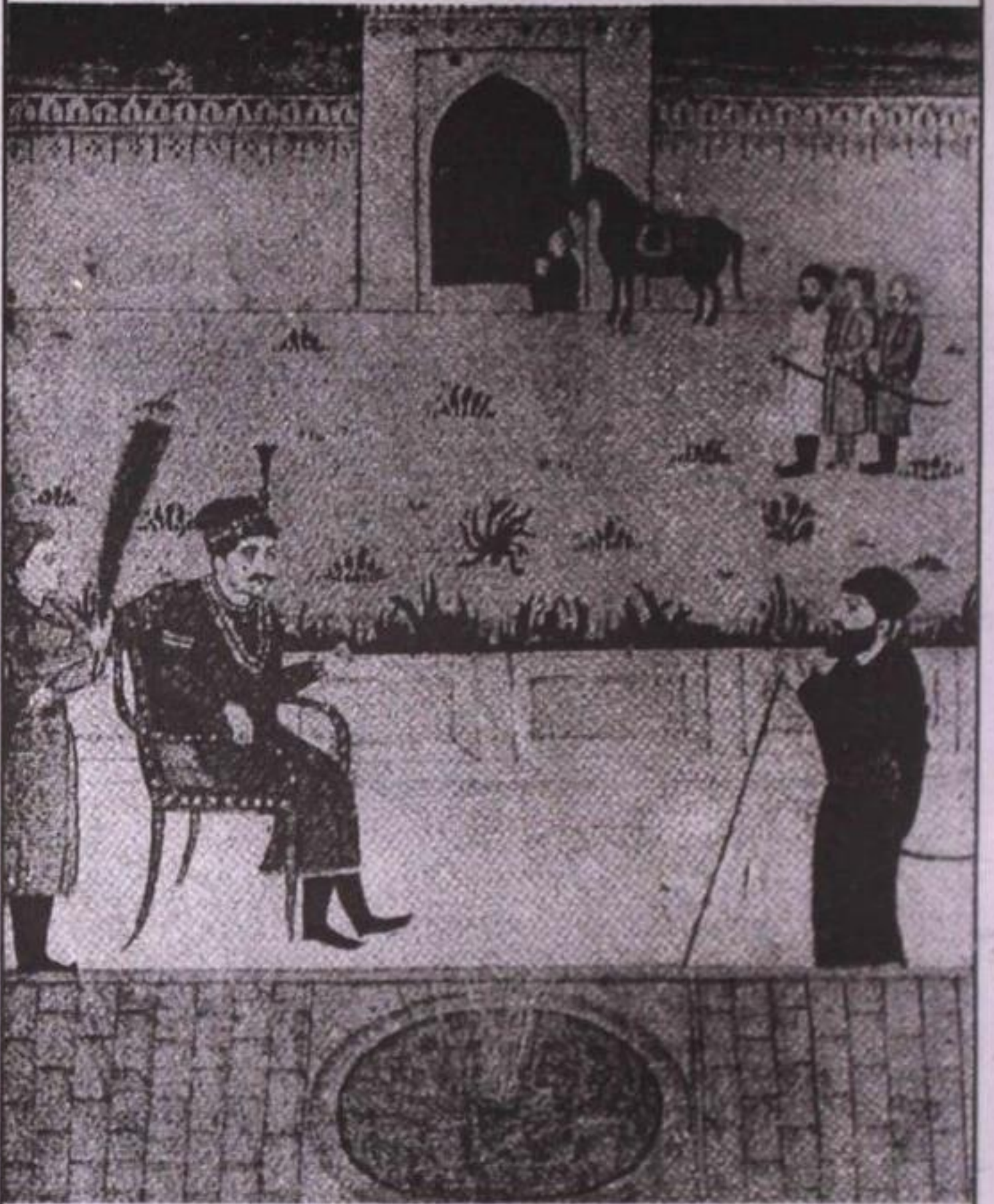
خانخاناں اکبر کو ایک گھوڑا پیش کرتے ہوئے
(اکبر نامہ۔ برٹش لائبریری، لندن)
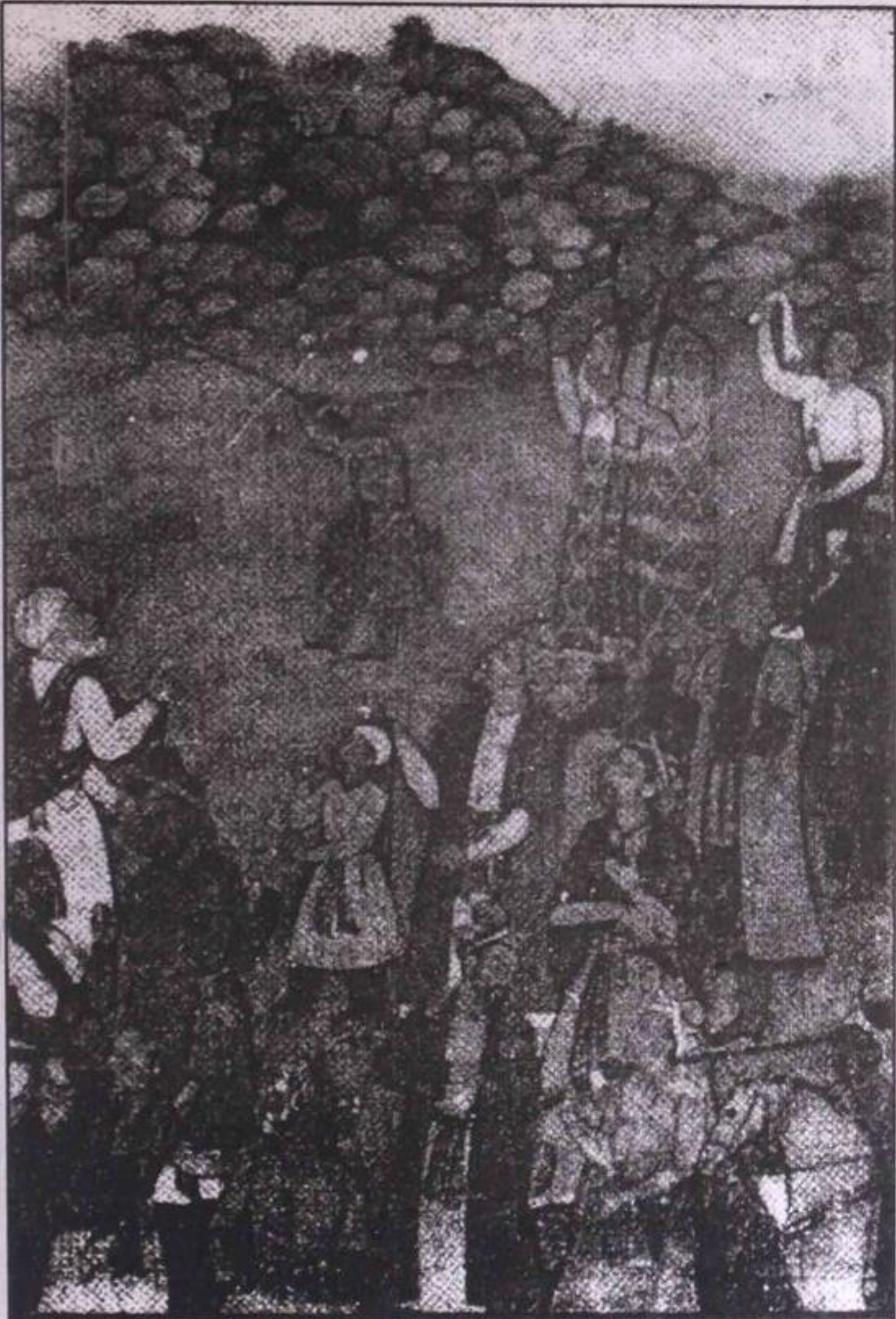
شہزادہ اکبر بیرم خاں کی نگرانی میں بندوق سے نشانہ لگاتے ہوئے
(برٹشِ میوزیم لائبریری)
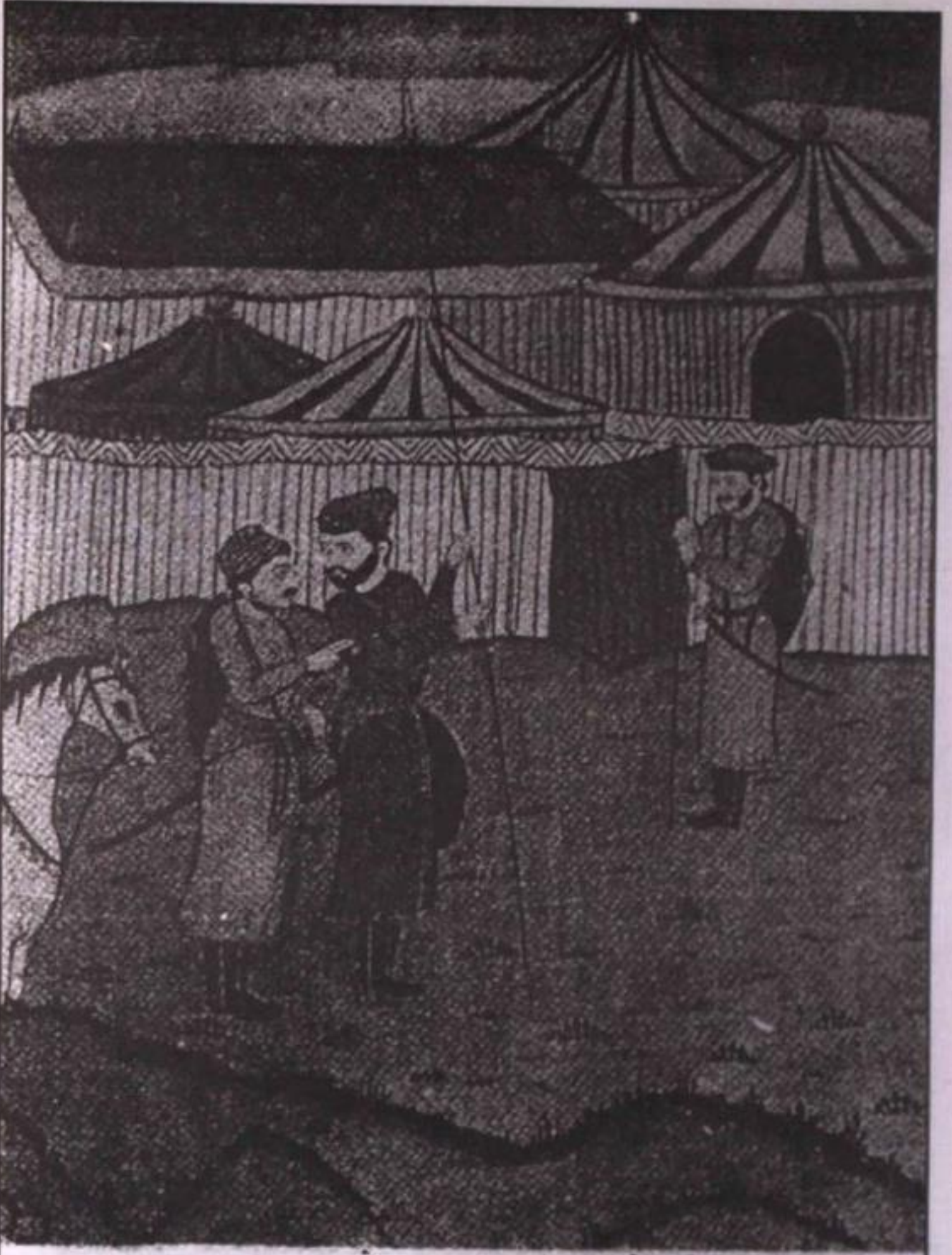
خیموں اور سراپردوں کے سامنے بیرم خاں، تردی بیگ سے بات چیت کرتے ہوئے
سراپردہ کی ایجاد بیرم خاں کی دَین ہے۔
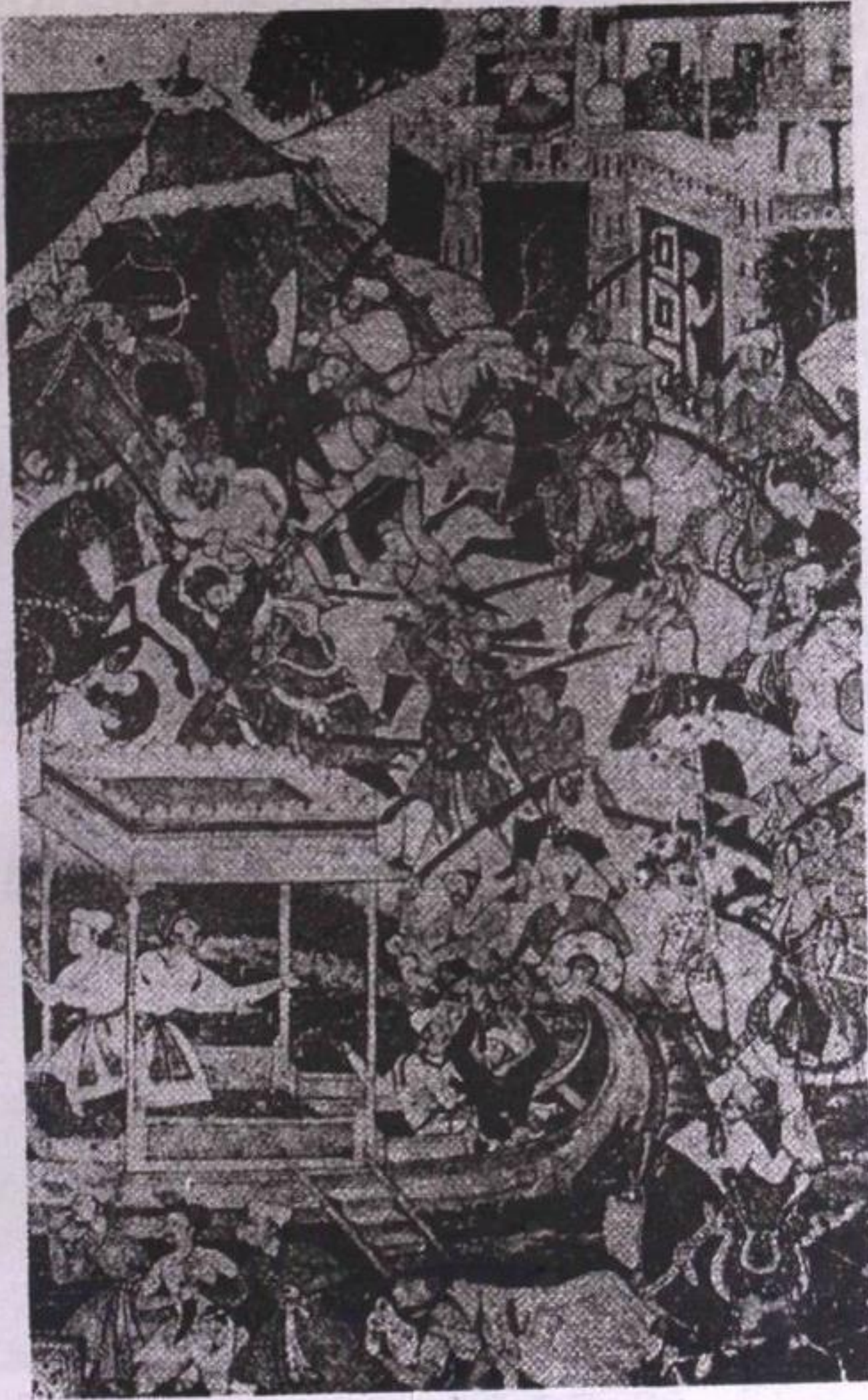
ہیمو خانخاناں اور اکبر روبرو لایا گیا (اکبرنامہ۔ ایران)
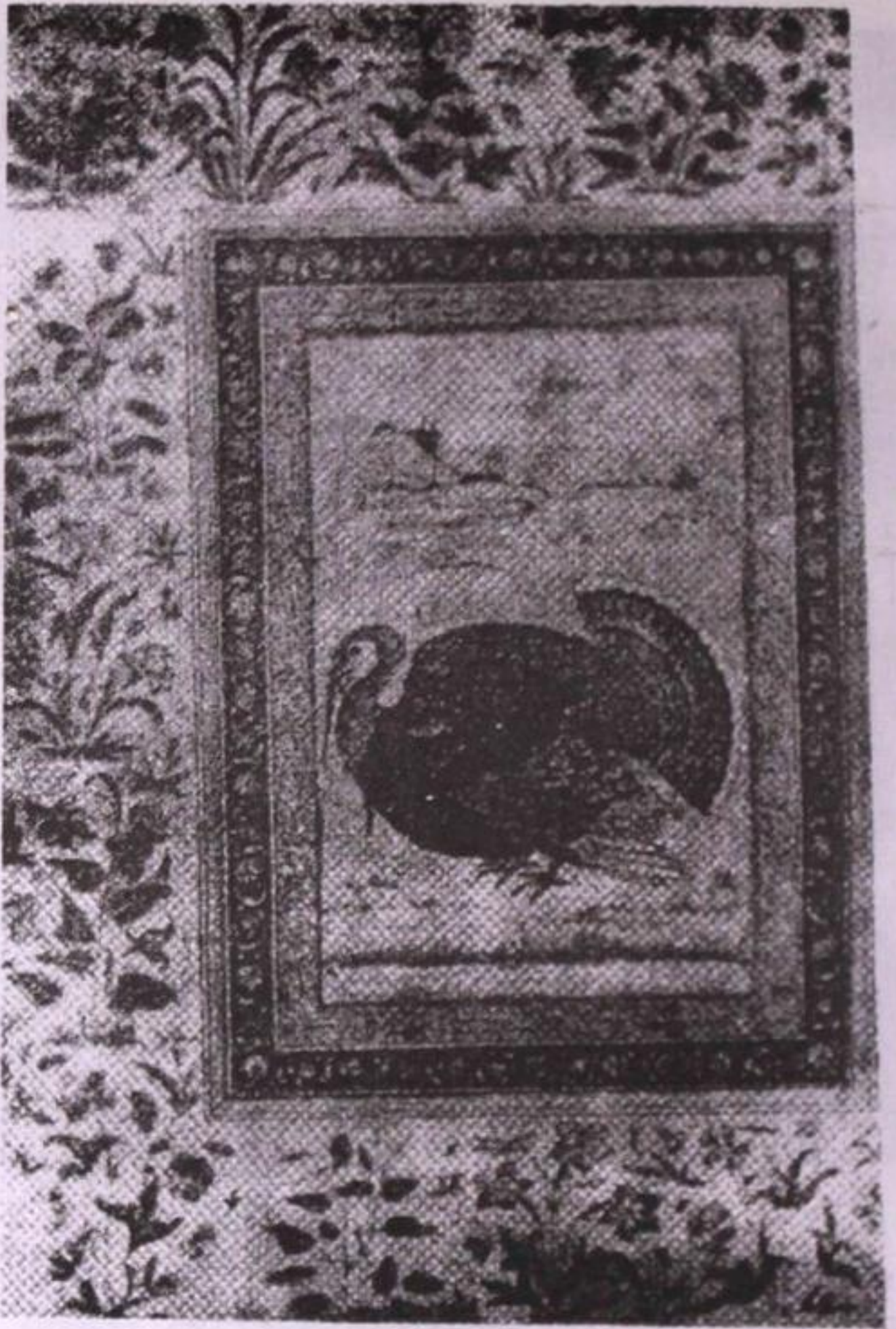
جہانگیر کے عہد کی ایک نادر تصویر، ایک مرغ ہے، حاشیے میں گلکاری، اندرونی حاشیہ میں باریک لفظوں میں فارسی کی نظم تحریر ہے اور اوپر بائیں جانب جہانگیر کی مہر کندہ ہے (۱۶۰۵۔۱۶۲۷)
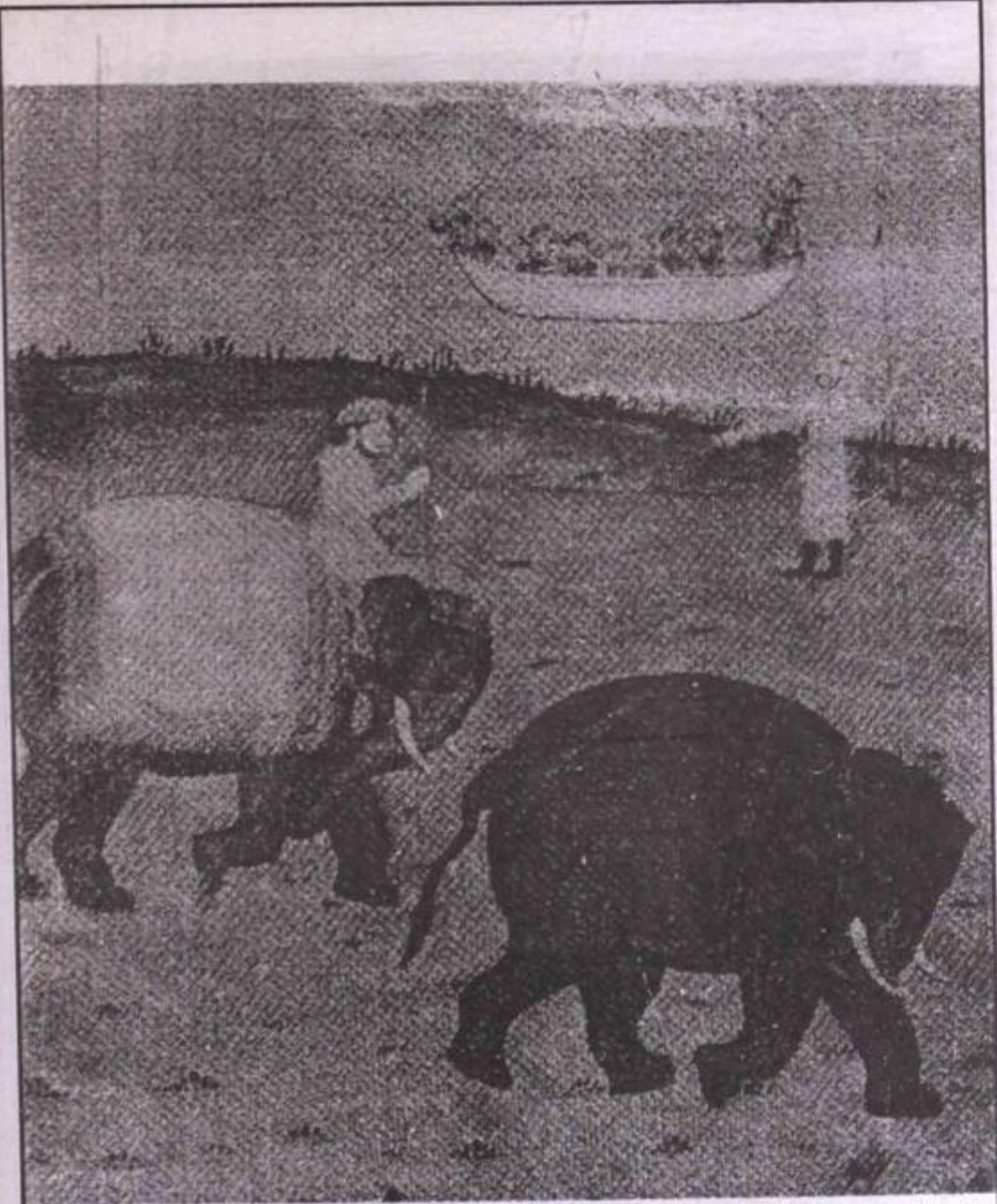
جمنا میں ایک مست ہاتھی خانخاناں کو تنگ کرتے ہوئے
(برٹش میوزیم لائبریری، لندن)
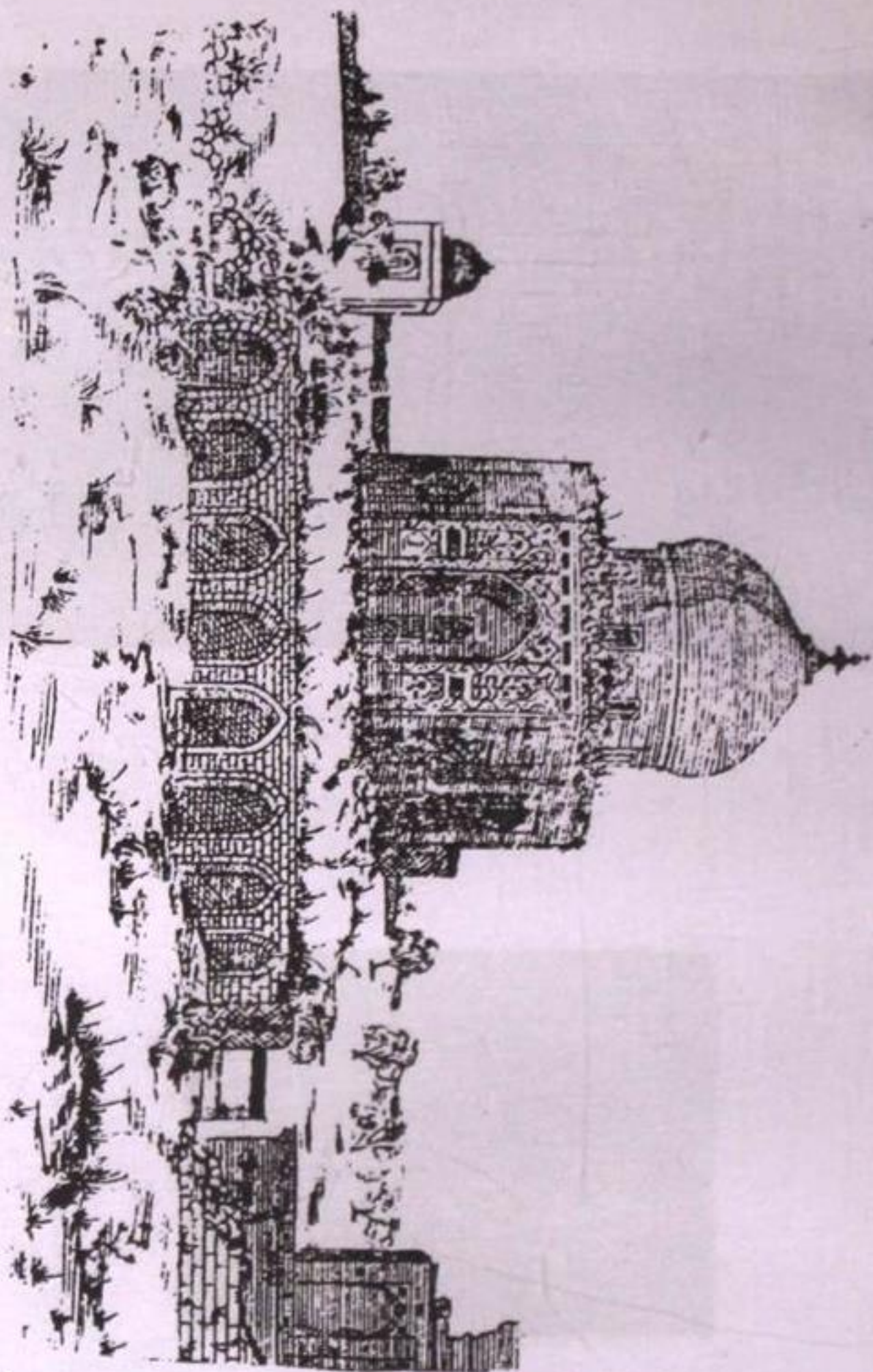
نیلا برج یا مقبرہ میاں فہیم

احمد آباد کے قریب روزہ سرکھیج

مسجد رانی روپ متی ۔ احمد آباد

ہندوستان
اور
وسطی ایشیاء
خانِ خاناں کے زمانے میں
آرمینیا
بحیرہ قزوین
سمرقند
بخارا
ماوراء النہر
مرو
کاشغر
مشہد
نیشاپور
خراسان
رے
قزوین
ہمدان
بغداد
کابل
پشاور
ایران
ہرات
قندھار
سیستان
بصرہ
بحیرہ فارس
کشمیر
کانگڑہ
لاہور
ملتان
پانی پت
دہلی
آگرہ
بیکانیر
اجمیر
بھکر
سندھ
عمرکوٹ
گجرات
پٹن
احمد آباد
سورت
احمد نگر
دکھن
دریائے گنگا
ہندوستان
عرب
اومان
بحیرہ عرب
مدینہ
مکہ
یمن
افریقہ
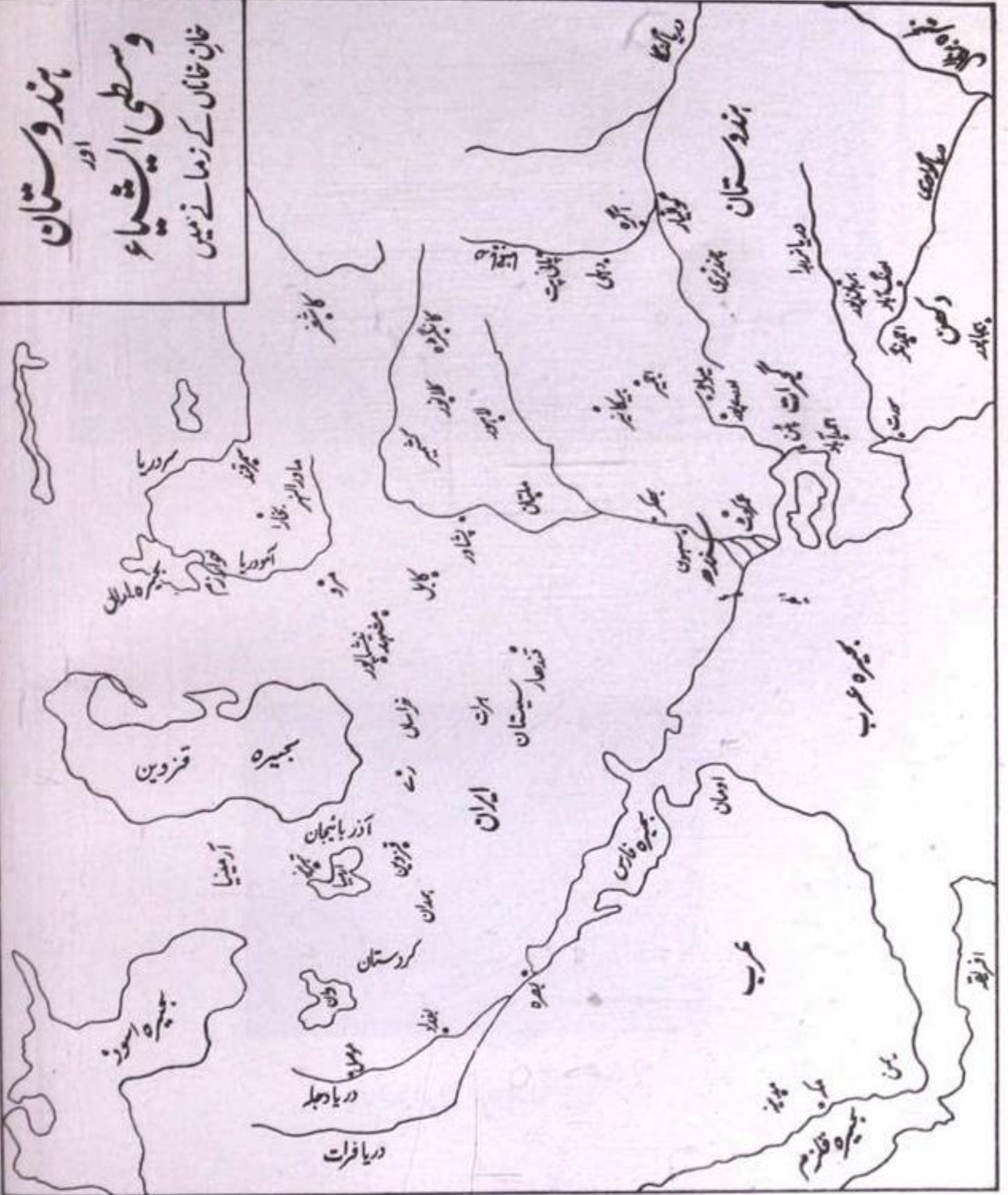
# عبدالرحیم خانخاناں

## ابتدائی زندگی

جب مغل فوج ہیمو کے خلاف برسرپیکار تھی تو بیرم خاں کے بیوی بچوں کو لاہور منتقل کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ ہیمو کی طاقت کو ختم کر دیا گیا تھا لیکن اکبر کا ایک اور حریف سکندر سور پنجاب میں مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ اکبر نے ایک ماہ دلّی میں قیام کیا ہوگا کہ سکندر سور کے خلاف مہم پر نکلا اور سرہند پہنچا۔ مغل فوجیں سرہند سے لاہور کی طرف کوچ کر رہی تھیں۔ بادشاہ اور بیرم خاں جن کی قیادت کر رہے تھے۔ راستہ میں خبر پہنچی کہ لاہور میں بیرم خاں کے بنوائے ایک محل میں جمال خاں میواتی کی چھوٹی بیٹی اور بیرم خاں کی بیوی نے جمعرات کے دن مورخہ ۱۴ صفر ۹۶۴ھ یعنی ۱۷ دسمبر ۱۵۵۶ء کو ایک بیٹے کو جنم دیا ہے جس کا نام عبدالرحیم رکھا گیا۔ بیٹے کی پیدائش ایک نیک شگون مانا گیا کیونکہ بادشاہ کو پنجاب میں مکمل فتح حاصل ہو گئی تھی۔ بادشاہ نے جشن کا حکم دیا۔ اس وقت ہیمو مہم فتح ہو چکی تھی۔ یہ زمانہ بیرم کے بڑھاپے کے تھا۔ وہ شکار کھیل کر لاہور کی جانب آ رہا تھا اسے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع ملی۔ بیرم خاں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا کہ بڑھاپے میں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ جس کو خبر ملی وہ مبارکبادی کے لئے دوڑا۔ شاعروں نے قصیدے لکھے۔ بھانڈوں نے ناٹک کھیلے۔

پٹن کے مقام پر جب بیرم خاں کو قتل کر دیا گیا تو رحیم کی عمر چار پانچ

سال تھی ماں اور بیٹے کو بمشکل احمد آباد پہنچایا گیا۔ اکبر نے حکم دیا کہ بچہ اور اس کی ماں سلیمہ بیگم کو بحفاظت دربار میں لایا جائے۔ وفادار نوکر انہیں لینے کے لیے بھیجے گئے۔ جو ۱۵۶۱ء کی ابتدا میں آگرہ پہنچے۔ بادشاہ نے رحیم کو اپنی گود میں بٹھایا۔اس کے عیش و آرام کے احکامات صادر کیے۔ یہ تاکید کر دی گئی کہ بچہ کے سامنے مرحوم باپ کا کوئی ذکر نہ کرے۔ بابا زنبور کو اس کی خدمت کے لئے مقرر کیا گیا۔ رحیم اپنے بچپن میں کبھی کبھی اپنے بابا کے بارے میں پوچھ لیتا تو اسے جواب دیا جاتا۔ ''بیٹا وہ حج کے لئے گئے ہیں۔ خدا کے گھر گئے ہیں۔ جلد آجائیں گے۔'' بادشاہ بابا زنبور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کرتا ''دیکھو! رحیم میرا بیٹا ہے۔ اس کو میری نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔'' بادشاہ نے اپنے خاص لوگوں کو ہی اس کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا اور بادشاہ کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے وہ کوئی کوتاہی نہ کرتے تھے لیکن دربار میں بیرم خاں کے بہت دشمن موجود تھے۔ جو بادشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ وہ دوران گفتگو گھما پھرا کر بیرم خاں کی زیادتیوں کا ذکر کرتے اور مقصد رحیم کے تئیں بادشاہ کی محبت کو کم کرنا تھا۔ مگر بادشاہ پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ تمام مخالفتوں کے باوجود اکبر نے رحیم کو اپنے وقت کی بہترین تعلیم دلائی۔ نہ صرف اسلامی علوم پڑھانے کا انتظام کیا بلکہ فوجی تربیت بھی دلائی۔ اس زمانہ کے ایک عالم ملاّ محمد اندجانی کو رحیم کا استاد مقرر کیا۔ اس کے علاوہ بھی ہر شعبہ علم کے لئے الگ الگ استادوں کو مقرر کیا۔ عبدالرحیم غیر معمولی ذہانت اور قوی حافظہ کا مالک تھا۔ اس لیے وہ چیزوں کو جلد سیکھ لیتا۔ اس زمانہ کے مروجہ علوم میں قرآن و حدیث، منطق و فلسفہ، ادب، قواعد، خطاطی وغیرہ تھے جو رحیم نے بھی حاصل کیے۔ عربی، فارسی، ترکی زبانیں سیکھیں۔ رحیم کو زبانیں سیکھنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ وہ اور بھی کئی زبانیں جانتا تھا۔ سنسکرت اور ہندی خاص طور پر سیکھی تھی۔ علم و ادب کے تئیں اس کی خصوصی دلچسپی تھی اور وہ درویشی مزاج رکھتا تھا۔ جو اسے ورثہ میں ملا تھا۔ ننھال کی طرف سے وہ ایک صوفی گھرانہ سے تعلق رکھتا تھا۔ رحیم کے بچپن کے

بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے مورخین کسی شخص کی طرف اسی وقت توجہ دیتے تھے جب اسے کوئی عہدہ ملتا تھا۔ اس لیے رحیم کی زندگی کے تفصیلی حالات اسی وقت سے دستیاب ہوتے ہیں جب سے اس نے جنگی مہمات پر جانا شروع کیا۔ وہ شاعر و ادیب اور عالم بھی تھا۔ اس نے تقلید پسند علما کی قرآن کی تفسیروں کو رد کر دیا تھا۔ وہ اس کے نزدیک ذہنی جمود و تنگ نظری کا نتیجہ تھیں۔

جب رحیم سن بلوغت کو پہنچا تو بادشاہ نے اسے مرزا خاں کا خطاب دیا۔ اور اس کی شادی ماہ بانو سے کر دی جو مرزا عزیز کوکلتاش (خان اعظم) کی بہن، شمس الدین محمد خاں (اتکا خاں) اور ماہم انگا کی بیٹی تھی۔ یہ سب اکبر کے رضاعی رشتے دار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے یہ شادی اس لیے کی تھی تاکہ اس کے باپ کے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے رحیم کو نجات حاصل ہو اور اسے کوئی تنگ نہ کرے۔ دوسرے لفظوں میں دربار میں رحیم کی پوزیشن مضبوط بن جائے۔7

### اولاد

رحیم اپنی بیوی ماہ بانو سے بہت محبت کرتا تھا اور وہ بھی ایک وفاد شعار خاتون تھی۔ اس کی سیرت و شخصیت کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں تاہم شوہر کی زندگی کی کامیابیوں میں اس کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے رحیم کے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ ماہ بانو کا انتقال ۱۵۹۷ء میں انبالہ کے مقام پر ہوا۔ رحیم نے ایک اور خاتون سے شادی کی جس کا تعلق نہرکوٹ کی سودھا قوم سے تھا۔ شاید یہ ہندو خاتون ہوگی۔ ایک باندی بھی رحیم کے حرم میں داخل تھی جس کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ بیٹیوں کے بارے میں زیادہ تفصیلات معلوم نہیں تاہم رحیم کی دو بیٹیوں کے نام معلوم ہیں۔ ایک کا نام جاناں بیگم اور دوسری کا خیر النسا تھا۔ جاناں بیگم کی شادی شہزادہ دانیال سے ہوئی تھی جو کثرت شراب نوشی کی وجہ سے عین

جوانی میں مر گیا اور جاناں بیگم بیوہ ہو گئی۔ جاناں بیگم کافی بعد تک زندہ رہی اور باپ کی خدمت کرتی رہی۔ وہ نیک سیرت اور مذہبی خاتون تھی۔ بیوہ ہو جانے کے بعد ہمیشہ سفید کپڑے پہنتی تھی۔ یہاں تک کہ رنگین کپڑا تک استعمال نہیں کرتی تھی۔ نہایت ذہین اور سلیقہ مند تھی۔ جاناں بیگم کے بارے میں تزک جہانگیری میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک مرتبہ جب وہ باپ کے ہمراہ دکن میں تھی تو رحیم نے جہانگیر کی دعوت کی۔ موسم خزاں تھا۔ باغ ویران تھا۔ تمام پھول و پتے خشک ہو گئے تھے۔ جاناں بیگم نے مصوروں کی مدد سے ان پیڑوں پر نقلی پھول اور پتیاں بنوائیں اور پھل بھی لگوا دیے۔ یہ منظر بالکل اصل میں بدل گیا۔ بادشاہ نے موسم خزاں میں ایسا ہرا بھرا باغ دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ پھل کو ہاتھ لگایا تو مصنوعی معلوم ہوا۔ یہ دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی کہ پورا باغ نقلی ہے۔

خیر النساء کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی شادی کس سے ہوئی تھی۔ ایک اور بیٹی کا ذکر ملتا ہے جس کی شادی امیر الدین نام کے شخص سے ہوئی تھی اور جو میر جمال الدین انجو کا بیٹا تھا جس نے ایک فارسی لغت فرہنگ جہانگیری تصنیف کی تھی۔ ان کے علاوہ ایک چوتھی بیٹی بھی تھی جس کا نام معلوم نہیں اس کی شادی شہزادہ مراد سے ہوئی تھی۔

تیس سال کی عمر تک رحیم بیٹوں کی خوشی سے محروم رہا۔ ایک دن بادشاہ نے باتوں باتوں میں کہا رحیم تین بیٹوں کا باپ بنے گا اور ان کے نام ایرج، داراب اور قرن ہوں گے۔ عجب اتفاق تھا کہ یکے بعد دیگرے رحیم کے یہاں تین بیٹے پیدا ہوئے اور نام بھی وہی رکھے گئے۔ مرزا ایرج سب سے بڑا لڑکا تھا جو ۱۵۸۵ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی زندگی اکبر کے زیر سایہ گزری۔ دکن میں اس نے اپنے باپ کے ہمراہ معرکوں میں حصہ لیا۔ باپ نے اپنے تمام بیٹوں کو اچھی تعلیم دلائی۔ ایرج نے مروجہ علوم حاصل کیے۔ وہ بہترین خطاط تھا۔ نسخ اور نستعلیق کا ماہر تھا۔ اس عہد کے مشہور ہندی شاعر کیشو داس نے ایرج کی تربیت کے لیے

جہانگیر چندریکا کتاب لکھی۔ جہانگیر نے اسے شاہنواز کا خطاب دیا تھا۔ اکبر نے اپنے فرمانوں میں اور ابولفضل نے رحیم کے نام خطوں میں اکثر ایرج کا ذکر کیا ہے۔ اسے تین ہزاری ذات اور پانچ ہزاری سوار کا منصب عطا ہوا تھا۔ وہ شکل و صورت میں اپنے باپ سے مشابہ تھا۔ باپ کی صفات بھی ورثہ میں ملی تھیں۔ اسی لیے بادشاہ اور امرا اسے ''خانخاناں خورد'' کہتے تھے۔

دکن میں ایرج نے کئی معرکے انجام دیے تھے۔ اس نے تلنگانہ کی جنگ میں ملک عنبر کو پسپا کیا۔ وہ جنگجو اور بہادر سپاہی تھا اسی کے ساتھ اہل فن کی بھی قدر کرتا تھا جو اکثر اس کی صحبت میں رہتے تھے اور وہ ان سے علم و دانش کی باتیں سنا کرتا تھا۔ بلا کا شراب نوش تھا۔ جہانگیر تزک میں اس کی شراب نوشی کا ذکر کرتا ہے اور خانخاناں کو تاکید کرتا ہے کہ اسے شراب نوشی سے منع کرے۔ برہان پور میں جب رحیم بیٹے ایرج کو دیکھتا ہے تو اسے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ کثرت شراب نوشی نے اسے بہت کمزور کردیا تھا۔ باپ نے بہت علاج کیا۔ مگر وہ شراب نوشی سے ۳۳ سال کی عمر میں مرگیا۔

مرزا ایرج کے دو بیٹے منوچہر اور طغرل تھے جنہوں نے باپ کے ہمراہ جنگوں میں حصہ لیا۔ اکثر ان کا بھی ذکرآتا ہے۔ ایرج کی ایک بیٹی تھی جس کی شادی شاہجہاں سے ہوئی تھی۔

رحیم کا دوسرا بیٹا داراب خاں تھا۔ ۱۵۸۶ میں پیدا ہوا۔ وہ بھی بڑا لائق اور بہادر نوجوان تھا اس نے دکن میں ملک عنبر کے خلاف کئی کامیاب مہمیں چلائیں اور سرخرو ہوا۔ کس طرح وہ عبرتناک انجام کو پہنچا اس کا ذکر ہم اگلے صفحات میں کریں گے۔

تیسرا بیٹا قرن تھا جو ۱۵۸۹ میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش پر بڑا جشن منایا گیا اور بادشاہ خود رحیم کو مبارک باد دینے آیا۔باپ کا چہیتا تھا مگر نوعمری میں اس کا انتقال ہوگیا۔ رحیم کا چوتھا بیٹا رحمٰن داد تھا جو دوسری بیوی سے پیدا ہوا تھا۔ جس کا

تعلق سوہیا قبیلے سے تھا۔ وہ شاید ہندو خاتون تھی۔ وہ 1600ء میں پیدا ہوا۔ تزک جہانگیری میں اس کی پیدائش اور موت دونوں کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا بڑا بھائی داراب خاں دکن میں جنگ میں مصروف تھا تو وہ بھی بھائی کی مدد کے لئے دوڑ پڑا۔ بخار میں مبتلا ہوا۔ جنگ سے لوٹا تو اپنا جبہ اُتار دیا۔ ٹھنڈی ہوا لگی۔ بخار مزید تیز ہوگیا اور اسی حالت میں چل بسا۔ باپ کو بیٹے کی موت سے بڑا صدمہ پہنچا۔ وہ ہر دن اس کی موت کے غم میں ڈوبا رہتا تھا۔ رحمان داد کی ماں سودھا خاندان سے تعلق رکھتی تھی رحمان امرکوٹ میں قیام پذیر تھا۔ خانخاناں فخر سے کہا کرتا تھا کہ اکبر بادشاہ میری ننہال میں پیدا ہوا تھا۔ اس وجہ سے بھی خانخاناں رحمٰن داد کو عزیز رکھتا تھا۔

رحیم کا ایک اور بیٹا مرزا امر اللہ تھا جو لونڈی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ اس کی صحیح تربیت نہ ہوسکی۔ وہ بھی نوعمری ہی میں چل بسا۔ دکن کی مہمات کے دوران گونڈوانہ کے مقام پر اس نے ایک ہیرے کی کان پر قبضہ کیا تھا جس کے ہیرے اپنی چمک اور خوبصورتی کے لئے مشہور تھے۔

ایک اور بیٹا حیدر قلی تھا جسے رحیم پیار سے حیدری کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ اس کا انتقال بھی جوانی میں ہوا۔ وہ نشہ کی حالت میں آگ میں جل کر مر گیا۔ اس کا ذکر بھی آگے آئے گا۔ ایک اور بیٹا شاہ پسند تھا۔ مرزا امر اللہ کے سوا یہ تینوں بیٹے رحیم کی دوسری بیوی سے پیدا ہوئے تھے۔

میاں فہیم خانخاناں کا بیٹا تو نہ تھا مگر اسے بیٹو ں کی طرح پالا تھا۔ اس کے بارے میں کہاوت مشہور تھی۔ کمائیں رحیم لٹائیں فہیم۔ وہ غلام مشہور تھا۔ اس کا تعلق ایک راجپوت گھرانہ سے تھا۔ صالح ومتقی تھا۔ تہجد۔ چاشت اور اشراق تک کی نمازیں قضا نہیں ہوتی تھی۔ وہ درویشوں اور فقیروں کے ساتھ عزت و محبت سے پیش آتا تھا۔ مگر سپاہیوں کے ساتھ سخت گیر تھا اور کوڑے سے ان کی خبر لیتا تھا۔ فہیم نے کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ وہ صاحب الرائے بھی تھا۔ بہت اچھے مشورہ دیتا تھا۔

رحیم کو مہابت خاں کی مکاری سے اس نے آگاہ کیا تھا۔ اس نے اپنے آقا کی حفاظت کرتے کرتے جان دے دی۔8

## سیاسی زندگی آغاز

عبدالرحیم خانخاناں کی سیاسی زندگی کا آغاز دس سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ ۱۵۶۶ء میں اکبر کے رشتے کے بھائی محمد کلیم مرزا نے جو کابل کا حکمراں تھا۔ پنجاب پر حملہ کر دیا۔ بادشاہ نے اس کی سرکوبی کے لئے پنجاب کی طرف کوچ کیا۔ اس وقت بادشاہ نے رحیم کو خلعت عطا کی اور چند وفادار اور تجربہ کار امرا کے ساتھ اسے آگرہ میں سلطنت کے انتظام و انصرام کے لئے مقرر کیا۔ اسی دوران اکبر کو گجرات کی مہم پر روانہ ہونا پڑا۔

گجرات میں احمد شاہ ثانی کے قتل (۱۵۶۱ء) کے بعد مطلق العنانی پھیلی ہوئی تھی۔ نتو نام کا ایک نوجوان سلطان مظفر سوم کے نام سے گجرات کا حکمراں بن گیا۔

اس کے نام پر دوسرے امرا من مانی کر رہے تھے۔ اعتماد خاں جو اس کا وزیر تھا اس صورت حال سے پریشان تھا۔ اس نے حالات کی درستی کے لئے اکبر کو لکھا۔ بادشاہ نے مظفر شاہ سوم کی بغاوت کو ختم کردیا۔ اور باغی فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ احمد آباد شہر کی چابی اکبر کے حوالہ کر دی۔ مظفر فرار ہوگیا۔ مرزا عزیز خان اعظم کو گجرات کا گورنر مقرر کر دیا۔ اکبر آگرہ واپس لوٹ آیا۔ اس مہم میں بادشاہ رحیم کو بھی اپنے ساتھ لے گیا جہاں پٹن کے مقام پر پڑاؤ ڈالا اور رحیم نے اپنے والد بیرم خاں کے مزار کی زیارت کی۔ اکبر کا مقصد بھی یہی تھا۔ بادشاہ نے رحیم کو بیرم خاں کی شہادت کے واقعات سنائے اور اس واقعہ کی یاد میں پٹن کا ضلع اسے جاگیر میں عطا کیا۔ رحیم ابھی کم عمر تھا۔ اس لیے سید احمد بارہ کو اس کا معاون اور جاگیر کا منتظم مقرر کیا تاکہ رحیم کو سادات بارہ کا بھی تعاون اور تحفظ حاصل

ہو جائے۔ لیکن چند ماہ کے اندر گجرات میں پھر سے بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس مرتبہ محمد حسین مرزا، اور اختیار الملک گجراتی (حبشی) نے رائے داس اور شیر خاں فولادی کے ساتھ مل کر بغاوت کر دی اور احمد آباد پر حملہ کر دیا۔ شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ عزیز کوکا خان اعظم نے مدد کے لئے بادشاہ کو لکھا۔ بادشاہ نے پھر سے بذات خود گجرات جانے کا فیصلہ کیا۔ بلا تاخیر وہ اونٹنیوں پر سوار ہو کر آگرہ سے ۲۳ اگست ۱۵۷۳ء کو احمد آباد کے لئے روانہ ہوا۔ عبدالرحیم خانخاناں اس کے ہم رکاب تھا جس کی عمر اس وقت صرف سولہ سال تھی۔ اکبر نے آگرہ سے احمد آباد تک کا یہ سفر صرف نو دن میں پورا کر لیا جو تاریخ کا ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اونٹنیوں پر اتنے لمبے فاصلے کو اتنی جلدی طے کرنے کی دوسری مثال نہیں ملتی ہے۔ یہ جنگ اس اعتبار سے بھی اہم تھی کہ اکبر نے صرف تین ہزار فوجوں کے ساتھ باغیوں کی بیس ہزار فوجوں کو شکست دی۔ اس جنگ میں باغیوں کے دو ہزار افراد کام آئے۔ بادشاہ نے اس پوری مہم کو تین ہفتوں میں مکمل کر لیا۔ عزیز کوکا کو پھر سے گجرات کا گورنر مقرر کرنے کے بعد وہ دارالخلافہ واپس لوٹ آیا۔ عبدالرحیم خانخاناں نے بھی اس جنگ میں نمایاں رول ادا کیا۔ اسے مرکزی دستہ کی کمان سپرد کی گئی تھی جو عام طور پر بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ابوالفضل نے آئین میں ۳۷ افسروں کے نام دے ہیں جو بادشاہ کے ساتھ تھے۔ ان میں رحیم کا نام پہلے نمبر پر لکھا ہے۔

بادشاہ نے عزیز کوکا کو گجرات سے واپس بلا لیا۔ گھوڑوں کو داغنے اور ان کا حساب کتاب رکھنے کا نیا شعبہ قائم کیا تاکہ منصب دار فرضی حساب نہ رکھ سکیں۔ مرزا عزیز کوکا کو اس شعبہ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس نے اس کام کو انجام دینے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے اسے معزول کر دیا اور اس کے بعد عزیز کوکا اپنے گھر میں نظر بند رہا اور ایک درویش کی زندگی گزارتا رہا۔ اس کی جگہ عبدالرحیم خانخاناں کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ اس کی مدد کے لیے آزمودہ کار امرا کو مقرر کیا۔ وزیر خاں ہروئی کو نائب صوبیدار بنایا۔ میر علاؤ الدولہ کو امین، سید مظفر بخشی اور بین

داس (پیاگ) کو دیوان مقرر کیا۔ رحیم نے اعلیٰ کارکردگی کا ثبوت دیا اور اس کے حسن نظام سے بادشاہ بہت خوش ہوا۔

رحیم کی عزت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور وہ تیزی سے ترقی کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس میں بادشاہ کی خصوصی توجہ کا بھی دخل تھا۔ ۱۵۷۶ء میں خانخاناں کو شہزادہ سلیم (جہانگیر) کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ یہ اعزاز بھی اہمیت کا حامل تھا۔ ہر طرح سے موزوں شخص کو ہی یہ خدمت سپرد کی جاتی تھی۔ جو عالم فاضل بھی ہو، جنگی اور سیاسی سوجھ بوجھ بھی رکھتا ہو۔ جو اہل قلم بھی ہو اور اہل سیف بھی۔ جب رحیم کو شہزادہ کا اتالیق مقرر کیا گیا تو رحیم کی عمر ۲۰ سال تھی اور شہزادہ تیرہ سال کا۔ اس موقع پر رحیم نے ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا۔ بادشاہ کو گھر پر آنے کی دعوت دی۔ قلعہ سے گھر تک سونے اور چاندی کے پھولوں کی بارش کی گئی۔ پورے راستے میں مخمل اور زربفت کا قالین بچھایا گیا۔ گھر میں بیٹھنے کے لیے ایک چبوترہ تعمیر کیا گیا جس پر سوالاکھ روپیہ خرچ آیا۔ آج کے زمانہ کے کروڑ سے زائد روپے ہوں گے۔ بادشاہ کو اس چبوترہ پر بٹھا کر قیمتی نذرانے پیش کیے گئے اور جب بادشاہ اس چبوترے سے اٹھ کر اندر زنانہ خانہ میں گیا تو چبوترہ کو لٹوا دیا گیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس چبوترے کی کئی قیمتی اشیا امرا تک اٹھا کر لے گئے۔ بادشاہ نے رحیم کو جھنڈا اور دوسرے شاہی نشانات اور اعزازات عطا کیے جو اس سے پہلے شاہی گھرانہ کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں دیے گئے تھے۔ خانخاناں اپنی پگڑی میں کلغی اور پَر کا استعمال کر سکتا تھا جو صرف شاہی خاندان کے افراد کا اعزاز تھا۔

رحیم نے بحیثیت اتالیق شہزادہ سلیم کو مختلف علوم کی تعلیم دی۔ فارسی، ترکی اور ہندی زبانیں سکھائیں۔ ان زبانوں کے ادب سے روشناس کرایا۔ فن خطابت اور گفتگو کرنا سکھایا۔ سیاست کے گر بتائے۔ بعد میں شہزادہ نے اپنے دور حکومت میں اس تربیت سے پورا فائدہ اٹھایا۔

اجمیر میں فتنہ و فساد کی روک تھام کے لئے رحیم کو مقرر کیا گیا۔ رنتھنبور کی جاگیر کا انتظام بھی اس کے سپرد ہوا۔ اس زمانہ میں یعنی ۱۵۸۰ء میں رحیم کو میر عرض کا عہدہ بھی سپرد ہوا۔ اس عہدہ پر بادشاہ کا خاص معتمد ہی مقرر کیا جاتا تھا اور وہ عموماً شاہی گھرانہ کا فرد ہوتا تھا۔ میر عرض کا کام امرا اور حکّام کی عرضیاں اور شکایتیں بادشاہ تک پہنچانا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان عرضداشتوں پر میر عرض کو اپنی رائے بھی لکھنی ہوتی ہوگی جس کے لئے سیاسی بصیرت اور تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد رحیم کی جنگی مہمات کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ جہاں سے اسے پھر پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی۔ گجرات، سندھ اور دکن میں فوج کی آزادانہ کمان اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اب اسے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے بھرپور مواقع حاصل تھے۔

# گجرات کی مہم

عبدالرحیم خانخاناں کے سلسلہ میں گجرات کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ رحیم کی سیاسی زندگی میں گجرات کی بڑی اہمیت ہے۔ گجرات سے نہ صرف یہ کہ اس کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے بلکہ اس کے کارنامے منظر عام پر آتے ہیں۔

گجرات کو اس زمانہ میں کئی اعتبار سے کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ گجرات قدرتی وسائل سے مالا مال اور تجارت کا بڑا مرکز بھی تھا، بین الاقوامی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے تھے۔ گجرات مسلم حکمرانوں کی چھاؤنی بھی تھا۔ ساحل سمندر پر ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ یورپی قومیں اس کی بندرگاہ پر آنا شروع ہوگئی تھیں۔ سورت میں پرتگالیوں نے تجارتی کوٹھیاں قائم کرلی تھیں۔ حاجی اکثر براستہ گجرات (سورت) حج کے لیے جاتے تھے جہاں ان کا واسطہ پرتگالیوں اور دوسرے یورپی لوگوں سے پڑتا تھا۔ کبھی کبھی یہ لوگ حاجیوں کو پریشان بھی کرتے تھے۔ انہیں لوٹ لیتے یا زبردستی پیسہ وصول کرتے۔ اکبر نے پرتگالیوں کے ساتھ ایک معاہدہ بھی کیا تھا اس کے تحت ان سے کچھ سمندری مراعات حاصل کر لی تھیں اور اس طرح سمندر پر پرتگالیوں کی بالادستی کو قبول کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر جب گجرات گیا تو اس نے وہاں پرتگالیوں کے جہاز میں بیٹھ کر کھمبات کے ساحل سے سمندر کی سیر کی جو احمد آباد سے تیس کوس کے فاصلے پر ہے۔ بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر وہاں موجود روم، ایران،

شام وغیرہ کے تاجر اپنے اپنے تجارتی سامان کے ساتھ بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئے جس سے پتہ چلتا ہے کہ گجرات میں بہت سے غیر ملکی تاجر بھی آباد تھے۔

چودہویں صدی کے اواخر میں جب دلّی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوا اور ملک کے مختلف حصّوں میں آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ گجرات بھی ایک خود مختار صوبہ بن گیا۔ محمد بن تغلق کے زمانہ میں مظفر شاہ گجرات کا صوبیدار تھا۔ اس نے بغاوت کر کے گجرات کو دلّی سلطنت سے آزاد کرلیا اور خود مظفر شاہ کے نام سے خود مختار سلطان بن گیا جو گجرات کا پہلا سلطان تھا۔

گجرات کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور طاقتور سلطان بہادر شاہ ہوا ہے۔ جس کے خلاف ہمایوں کو کئی جنگیں لڑنی پڑیں۔ بہادر شاہ نہ صرف یہ کہ گجراتی عوام میں مقبول تھا بلکہ پورے ہندستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں ہندستان کا بادشاہ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس کے گرد ملک کے ممتاز سپہ سالار اور جنگجو جمع ہو گئے تھے۔ جب ہمایوں نے افغانوں کی حکومت کو ختم کر دیا تو بہت سے افغان امرا بہادر شاہ کی پناہ میں آگئے۔ یہاں تک کہ مغلوں کے بھی بہت سے امیر بہادر شاہ کا دم بھرتے تھے اور اس کی فوج میں شامل تھے۔ قطب خاں فتح خاں، عالم خاں وغیرہ جیسے سردار جو بہت بااثر بھی تھے بہادر شاہ کے ساتھ شامل تھے۔ ہمایوں نے مسلسل جنگ کر کے بہادرشاہ کی طاقت کوختم کر دیا۔ ایک سردار ہندو بیگ نے ہمایوں کو مشورہ دیا تھا کہ گجرات کومغل سلطنت میں شامل نہ کیا جائے اور گجرات بہادر کو واپس کر دیا جائے۔ اگر ہمایوں ہندو بیگ کا یہ مشورہ مان لیتا تو مغل گجرات میں آئے دن کی بغاوتوں سے بچ جاتے۔ خون خرابہ بھی نہ ہوتا مگر اس زمانہ کی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر شاید یہ ممکن نہ تھا۔ ریونیو حاصل کرنے کا بھی سوال تھا۔ گجرات ہندوستان کی امیر ترین ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ فوجوں کومصروف رکھنا اور میدان جنگ فراہم کرنا اس زمانہ کی ضرورت تھی اور پھر جہاں بانی اور جہاں رانی مغلوں کا شوق بھی تھا جو کسی بھی بادشاہ کا

ہوتا ہے۔

ہندو بیگ کا مشورہ قبول نہیں کیا گیا اور گجرات کو مغل سلطنت کا حصہ بنا کر اسے مغل سرداروں میں بانٹ دیا گیا۔ عسکری مرزا، گجرات کا صوبیدار مقرر ہوا جس کا دارالخلافہ احمد آباد قرار پایا اور ہندو بیگ کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج متعین کی گئی۔ پٹن کا علاقہ یادگار ناصر مرزا کو دے دیا گیا۔ بھڑوچ اور سورت قاسم حسین سلطان کے حصہ میں آئے۔ کھمبات بڑودہ میں دوست بیگ کو مقرر کیا گیا۔ محمود آباد اور چمپانیر علی الترتیب میر بچکا اور تردی بیگ کو تفویض ہوئے۔

ہمایوں کی اس پالیسی نے گجرات کو فتنہ سامانیوں اور بغاوتوں کا مرکز بنا دیا۔ ہندو بیگ کا مشورہ ایک اہم اصول پر مبنی تھا کہ مقامی لوگوں کو اپنے حالات خود حل کرنے کا حق ملنا چاہیے۔ اس سے علاقائیت سر نہیں اٹھاتی۔ گجرات میں ہمایوں کی پالیسی کی وجہ سے مقامی عناصر کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ مظفر شاہی طاقتیں پھر ابھرنے لگیں۔

گجرات میں اکبر بھی اپنے باپ کی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ اکبر خود گجرات گیا اور وہاں بغاوتوں کو ختم کیا۔ دوبارہ وہ گجرات آیا اور دونوں بار عبدالرحیم خانخاناں اس کے ہمراہ تھا۔ اور ان مہموں کے دوران رحیم گجرات سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ مگر رحیم کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ ابھی بچہ تھا اور محض تربیت کے لیے وہ بادشاہ کے ساتھ تھا۔ ان معرکوں میں اس کی شرکت محض تربیتی نوعیت کی حامل تھی۔

اکبر نے مظفر شاہ گجراتی کا زور ختم کر کے شہاب الدین احمد خاں نیشاپوری کو گجرات کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ وہ پہلے بیرم خاں کے ساتھ تھا۔ اکبر کے دربار میں پنج ہزاری منصب کا مالک تھا۔ گجرات میں ہارنے کے بعد اس نے کچھ وقت مالوہ میں گزارا۔ مظفر اپنی سسرال لُمبا کاٹھی قبیلہ کے سردار کے یہاں راجکوٹ کے قریب ایک گاؤں کھردی میں گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اور اپنی

کھوئی طاقت کو حاصل کرنے کے لیے مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ مظفر گجراتی، گجرات کے اصل وارث سلطان محمود گجراتی کا بیٹا تھا۔ مظفر نے ایک کاٹھی لڑکی سے شادی کی تھی۔ اسی لیے اسے مقامی کاٹھی لوگوں اور قبیلے کولی کی حمایت حاصل تھی۔ وہ خود ایک بہادر سپہ سالار تھا۔ اتفاق سے اسے ناراض مغل امرا اور سپاہیوں کی حمایت بھی حاصل ہوگئی۔ شہاب الدین کو گجرات میں شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اس لیے ۱۵۸۳ء میں اکبر نے اسے گجرات سے واپس بلا لیا اور اس کی جگہ اعتماد خاں کو گورنر مقرر کیا۔ اعتماد خاں گجراتی کلچر کا پروردہ تھا اور مقامی رسم و رواج سے واقف کار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ خواجہ نظام الدین احمد کو وابستہ کیا گیا جو مشہور مورخ بھی تھا اور جس کی تاریخ طبقات اکبری آج بھی ایک مستند تاریخ مانی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں اس کی عمر بہت کم تھی۔ شاید سب سے کم عمر تھا۔ مگر نہایت بہادر اور جانباز تھا۔ رحیم کا وفادار تھا۔ خواجہ کی ایک بہن ہمایوں سے بیاہی تھی۔ اس طرح خواجہ بھی شاہی خاندان سے رشتہ رکھتا تھا۔ بعد میں اس نے رحیم کے ساتھ کئی جنگوں میں بڑی جاں نثاری کا ثبوت دیا۔ خواجہ کو اعتماد خاں کا بخشی مقرر کیا گیا۔ میر امین تراب صوبہ کا امین تھا جس پر بادشاہ کو پورا بھروسہ تھا۔ وہ بھی گجراتی تھا مگر سب سے پہلا امیر تھا جس نے بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ ایک اور امیر خواجہ ابوالقاسم کو دیوان کی حیثیت سے گجرات بھیجا گیا۔ چوتھا امیر جو بادشاہ نے گجرات بھیجا میر معصوم بھکری تھا۔ وہ بھی ایک مورخ تھا اور جس نے تاریخ سندھ لکھی۔ ان امرا اور سپہ سالاروں کے علاوہ بادشاہ نے آٹھ ہزار سپاہیوں کی جمعیت جو زیادہ تر بدخشی اور تورانی تھے مقرر کی تھی۔ انہوں نے شہاب الدین سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ جب اعتماد خاں کو گورنر مقرر کیا گیا تو ان سپاہیوں نے اپنی کچھ مانگیں پیش کیں جو تسلیم نہیں کی گئیں۔ مغل بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ سپاہیوں کی تنخواہ دس روپے ماہوار سے زیادہ نہ بڑھائی جائیں جو

سپاہیوں کو منظور نہیں تھیں۔ جس کے نتیجہ میں یہ امیر مظفر گجراتی سے جا ملے۔ مظفر کو اپنا سردار مقرر کیا۔ اس طرح مظفر گجراتی پھر میدان جنگ میں آ گیا۔ مغلوں سے دل برداشتہ سات ہزار سپاہی اس کے ساتھ تھے اور جو احمد آباد کی طرف بڑھے۔ راستہ میں مزید ایک ہزار گجراتی اور مغل ان کے ہمراہ ہو گئے۔ تین ہزار کاٹھی فوج اس کے ساتھ تھی۔ اعتماد خاں نے شہاب الدین سے نیا نیا چارج لیا تھا۔ ابھی اس کی پوزیشن مضبوط نہیں تھی۔ وہ مظفر کے گرد اتنی بڑی فوجی طاقت جمع ہونے سے بہت گھبرایا۔

اعتماد خاں نے شہاب الدین سے رابطہ قائم کیا جو ابھی مغل دارالسلطنت کی طرف روانہ ہوا تھا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ وہ اپنے تبادلہ سے پہلے ہی ناراض تھا۔ اس نے مدد دینے سے منع کر دیا۔ اعتماد خاں نے دو دن کی جدوجہد کے بعد آخرکار اسے راضی کر لیا۔ ادھر مظفر برابر دارالخلافہ کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ اس کی فوج میں ناراض مغل سپاہیوں کے علاوہ بڑی تعداد میں کاٹھی، کولی اور گجراتی جمع ہو گئے تھے۔ آخرکار مغل فوجوں اور مظفر کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں مغل ہار گئے اور مظفر گجراتی کو فتح حاصل ہوئی۔ اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ احمد آباد کی جامع مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھا۔ اس جنگ میں خواجہ نظام الدین احمد، شہاب الدین اور قطب الدین جیسے آزمودہ کار سپہ سالار بھی ہار گئے۔

شہاب الدین نے اس جنگ اور شکست کی تفصیلی رپورٹ اکبر بادشاہ کو بھیجی جسے پڑھ کر وہ پریشان ہوا۔ جب یہ خبر بادشاہ کو ملی تو وہ الہ آباد میں گنگا جمنا کے سنگم پر قلعہ کی تعمیر میں مصروف تھا۔ اس نے فوراً فوج گجرات بھیجنے کا فیصلہ کیا اور جس امیر کو سربراہی کے لیے چنا وہ نوجوان سپہ سالار عبدالرحیم خانخاناں تھا۔ اس عہد کے مورخین کے مطابق اس مہم کے لیے بہترین انتخاب تھا۔ دوسری بار اسے گجرات کا وائسرائے مقرر کیا جا رہا تھا۔ پہلی بار تو وہ محض اعزازی صوبیدار تھا۔

اس مرتبہ اسے پورے اختیار کے ساتھ یہ عہدہ دیا گیا تھا۔ اکبر نے اس کے نام جو فرمان تحریر کیا اس میں اسے فرزند کہہ کر مخاطب کیا۔ اور وہ تھا بھی فرزند، اس کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم اکبر کے حرم میں تھی۔ اس کے علاوہ فرمان میں اور بھی توصیفی کلمات رحیم کے لیے لکھے۔ رحیم کی عمر اس وقت ۲۷ برس تھی۔

اکبر نے بہت سے آزمودہ کار اور تجربہ کار مغل اور راجپوت افسر رحیم کے ساتھ مقرر کیے۔ سورت اور مالوہ کے حکمرانوں کو اس کی مدد کا حکم جاری کیا۔ قلیج خاں جو ہزار سپاہیوں پر امیر مقرر تھا۔ اسے بھی امداد کے لیے بھیجا۔ چنانچہ اس طرح بہت سے بہادر سپہ سالار جیسے رائے درگا، مدنی رائے، شیخ کبیر اور نصیب خاں، رحیم کے ہمراہ گجرات کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے علاوہ سید قاسم اور سید ہاشم بارہہ 23 (بارہہ کا مطلب بارہ گاؤں جو گنگا جمنا کے دوآبہ میں سنبھل پرگنہ کے قریب واقع تھے سید محمود بارہ خاندان کا سربراہ تھا سید ہاشم اس کا بیٹا تھا) بھی اس کے ساتھ تھے۔

دوسری جانب مظفر گجراتی نے بھی اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کو جو اس جنگ میں اس کے شریک تھے اعزازات اور انعامات سے نوازا۔ جاگیریں اور روپیہ پیسہ تقسیم کیا۔ اپنے نام کے سکے ڈھالے۔ ایک بڑی فوج اس کے گرد جمع ہوگئی۔ کولی اور گجراتی بڑی تعداد میں اس کے ہمراہ تھے۔ ان باغیوں نے احمد آباد سے کوچ کر کے بڑودہ کا محاصرہ کیا اور بیس دن کے محاصرہ کے بعد شہر ان کے قبضہ میں آگیا۔ بڑودہ کے گورنر قطب الدین محمد خاں (خان اعظم کا بھائی) کی وجہ سے بھی قلعہ اتنی جلدی فتح ہوگیا۔ اس نے مغلوں کے ساتھ غدّاری کی۔ مظفر گجراتی بڑودہ سے بھڑوچ کی جانب بڑھا۔ آخر کار بھڑوچ پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا۔ جہاں قطب الدین محمد خاں کے خاندان کے افراد پناہ گزین تھے۔ مظفر کو بے پناہ دولت ہاتھ لگی۔ دس کروڑ اور چالیس لاکھ روپے نقد ہاتھ آئے۔ کہا جاتا ہے کہ مظفر ایک زمانہ میں آگرہ میں بادشاہ

کا ادنیٰ ملازم تھا جہاں بادشاہ تیس روپے ماہانہ اسے دیتا تھا۔ جب وہ وہاں سے فرار ہوا تو اس کے تن پر صرف اپنے کپڑے تھے آج وہ کروڑوں کا مالک تھا اور گجرات اس کے قدموں میں تھا۔ چالیس ہزار سپاہ اس کی کمان میں تھی۔

مظفر گجراتی نے رحیم کی آمد کی خبر سنی تو وہ بھڑوچ چھوڑ کر سیدھا احمد آباد پہنچا جہاں کوئی اس کی حفاظت کے لیے موجود نہیں تھا۔ خواجہ نظام الدین احمد پٹن میں موجود تھا جہاں سے وہ رحیم کو تمام خبریں بھیجتا رہتا تھا۔ اس نے رحیم سے جلد پہنچے کی درخواست کی۔ وہ بہت جلد بھیمل کے مقام پر پہنچ گیا جو جالور ضلع میں واقع تھا اور غزنی خاں کے قبضہ میں تھا۔ غزنی خاں مغلوں کا پرانا نمک خوار تھا۔ یہاں غزنی خاں رحیم سے آکر ملا۔ رحیم نے اس سے مدد کی درخواست کی۔ اس نے آنا کانی کی۔ رحیم سمجھ گیا کہ اس کی نیت صاف نہیں۔ رحیم مارچ کرتا ہوا سروہی کے مقام پر پہنچا جہاں نظام الدین احمد اس سے آکر ملا اور اسے تمام واقعات سے مطلع کیا اور رحیم کو بڑی پھرتی کے ساتھ پٹن لے کر آگیا۔ جہاں وہ ایک دن رہا۔ یہاں اس نے امرا کے ساتھ مشورہ کیا۔

کچھ امرا نے مشورہ دیا کہ فوج کم ہے (جو صرف آٹھ سے دس ہزار تھی) ابھی مقابلہ نہ کیا جائے اور دکن اور مالوہ سے مزید کمک آنے تک انتظام کیا جائے۔ مظفر نے چالیس ہزار فوج جمع کر رکھی تھی۔ اور اس وسیع فوج سے رحیم کے کیمپ میں خوف و ہراس پھیلا تھا۔ بعض نے یہ مشورہ دیا کہ پہلے بادشاہ کو اطلاع دے کر مزید فوج منگوائی جائے۔ رحیم کے ساتھ تجربہ کار بوڑھا سپہ سالار دولت خاں لودی بھی تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ "بادشاہ کا بلانا مناسب ہے قلیج خاں کا انتظار ضروری نہیں، قلیج خاں پرانا سپہ سالار ہے اگر وہ آگیا تو جنگ جیتنے کا سارا کریڈٹ اسے جائے گا اور تم اور تمہاری فوج کو کچھ

حاصل نہ ہوگا۔ اگر چاہتے ہو کہ فتح کا ڈنکا تمہارے نام پر بجے تو یا قسمت یا نصیب۔ لڑ مرو اور یہ بھی سمجھ لو کہ بیرم خاں کے بیٹے ہو جب تک خود تلوار نہ مارو گے خانخاناں نہ بنو گے، اکیلے ہی فتح کرنی چاہئے اور گمنامی کے جینے سے ناموری کا جینا ہزار درجہ بہتر ہے۔''

بوڑھے سپہ سالار کی بات نوجوان رحیم کے دل میں اتر گئی۔ اس نے اعلان جنگ کر دیا۔ ڈپلومیسی کا ایک پینترہ بھی استعمال کیا۔ جھوٹی خبر اڑائی کہ بادشاہ خود تشریف لا رہے ہیں۔ خیمہ میں خوشی کے شادیانے بجوا دیے تاکہ دشمن بھی سمجھ لے کہ کیا بات ہے۔ آخر کار مخالف کیمپ میں بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ یہی مقصد تھا۔ دشمن کے سپاہیوں کی ہمت پست ہوگئی۔ اس کے بعد جنگ شروع ہوئی۔ احمد آباد سے تین کوس یعنی آٹھ کلو میٹر کے فاصلہ پر سرکھیج کے مقام 9 پر جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے یہ جنگ ہوئی سابرمتی ندی درمیان تھی۔ ایک طرف شاہی فوجیں ڈٹی تھیں دوسری طرف مظفر گجراتی کی فوجیں تھیں۔ دراصل خواجہ نظام الدین احمد کی فوجیں جب رحیم سے آکر ملیں تو دشمن کے کیمپ نے یہ سمجھا کہ بادشاہ اکبر کی فوجیں پہنچ گئیں۔ یا شاید قلیج خاں آگیا۔ کئی روز تک مقابلہ ہوا۔ اس لڑائی میں سید ہاشم ہارے اور خضر اتکہ جیسے مغل بہادر کام آئے۔ سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے۔ یہ ممکن تھا کہ رحیم یہ جنگ ہار جاتا۔ لیکن اس کی قسمت کا ستارہ بلندی پر تھا۔ اتنی کم فوج کے مقابلہ میں اس نے جنگ جیت لی۔ اس کو قسمت ہی کہیں گے۔ مظفر کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا اور کھنبات میں جاکر پناہ لی۔ کہا جاتا ہے اس جنگ میں مظفر کے دو ہزار سپاہی کام آئے۔ رحیم نے نماز شکرانہ ادا کی اور اکبر کے نام جنگ کی تفصیلی رپورٹ روانہ کی۔ رحیم دھوم دھام کے ساتھ احمد آباد میں داخل ہوا اور عام امن وسلامتی کا اعلان کیا۔ اور اس طرح سلطان مظفر کی مختصر حکومت کا خاتمہ ہوگیا جو صرف پانچ ماہ قائم رہی۔

مظفر میدان جنگ سے فرار ہوگیا مگر اس نے ابھی تک ہار تسلیم نہیں کی تھی۔ رحیم کے ساتھ ابھی اس کے کئی معرکے ہونے تھے۔ مظفر کھمبات پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کے بہت سے جاں نثار موجود تھے۔ وہ عوام میں مقبول تھا۔ اس لیے بارہ ہزار کی فوج پھر اس کے گرد جمع ہوگئی۔ مالوہ اور دکن سے جو فوجیں قلیچ خاں، نورنگ خاں اور تلک خاں کی قیادت میں آنے والی تھیں اور جن کی اتنی شہرت تھی وہ بڑودہ اس دن صبح پہنچی جس دن جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ رحیم نے انہیں بھڑوچ میں رہنے کا حکم دیا اور خود مظفر کے مقابلہ کے لیے بھڑوچ کی جانب بڑھا۔ رحیم کے سامنے ایک بڑا چیلنج تھا۔ مظفر آگے آگے بھاگتا پھرتا اور رحیم اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ کبھی ایک پہاڑی میں چھپتا کبھی دوسری میں۔ کبھی اس جنگل میں جاتا کبھی دوسرے جنگل میں۔ چھوٹے موٹے مقابلے بھی ہوتے رہے۔ آخر نادوت کے مقام پر پھر سے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور اس مقابلہ میں بھی مظفر کو شکست ہوئی اور وہ اپنی جان بچا کر بھاگا۔ اس معرکہ میں بھی ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ اکبر اس وقت الہ آباد سے آگرہ کے لیے راونہ ہو چکا تھا۔ راستہ میں اٹاوہ کے مقام پر اسے رحیم کی دوسری کامیابی کی خوشخبری ملی۔ اس نے وہیں خیمہ نصب کردیے اور نماز شکرانہ ادا کی۔ سرنج اور نادوت کی فتوحات کی خوشی میں بادشاہ نے رحیم اور اس کے ساتھیوں کو انعام و اعزاز سے نوازا۔ ان کے منصب بلند کیے۔ رحیم کو ''خان خانان'' کا خطاب عطا ہوا۔ پانچ ہزاری منصب دیا گیا۔ خلعت، ہیرے جواہرات سے جڑی ہوئی برچھی اور ایک جھنڈا (تومان تُغ) انعام میں دے گئے۔ اس جھنڈے کے استعمال کی اجازت بہت کم امیروں کو دی جاتی تھی۔ اسی طرح اس کے سب سے جانباز اور وفادار ساتھی خواجہ نظام الدین احمد کی بے لوث خدمات کا بھی اعتراف کیا گیا۔

خانخاناں نے اب گجرات کے نظم و نسق کی جانب توجہ دی۔ کچھ

اصلاحیں نافذ کیں مگر ابھی تک مظفر اس کے لیے پریشان کن بنا ہوا تھا۔ اس نے کاٹھیاواڑ میں پناہ لے رکھی تھی اور موقع کا منتظر تھا۔ خانخاناں پانچ سال تک گجرات کا گورنر رہا مگر وہ گجرات کی فتح کو اس وقت تک مکمل نہیں سمجھتا تھا جب تک مظفر زندہ اور فرار تھا چونکہ وہ ابھی بھی برابر مغل سلطنت کے خلاف منصوبے بنا رہا تھا۔ کاٹھی قبیلہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ اس نے جوناگڑھ کے راجہ امین خاں غوری سے مدد مانگی جس نے مظفر کو گونڈال ضلع دے دیا لیکن فوجی امداد کے لیے دو لاکھ ''محمودی'' (سکہ کا نام) طلب کیے جو مظفر نے اسے بھجوا دیے۔ اسی طرح اس نے دو لاکھ محمودی اور جھلاور کے راجہ جام ستار سل کو دیے۔ جھالاور، کاٹھیاواڑ کا ایک صوبہ کہلاتا تھا۔ مگر افسوس کہ وقت پر دونوں جاگیرداروں نے مظفر کو دھوکا دیا اور جب اس کا سامنا خانخاناں سے ہوا تو کوئی بھی اس کی مدد کے لیے نہیں پہنچا۔ جام تو کھلم کھلا خانخاناں سے جا ملا اور مظفر کی نقل و حرکت کی مخبری کرتا رہا۔ خانخاناں مظفر کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ مظفر جام کے علاقہ کو چھوڑ کر باغی کولیوں کے پاس جا چھپا اور بھاتی نام کا ایک کول سردار اس کی امداد کے لیے تیار ہوا۔ چنانچہ برانتی جی مقام پر مقامی لوگ جیسے کول بھومیار، گراسی اور دوسرے ناراض مقامی زمیندار مظفر سلطان کے گرد جمع ہو گئے اور شاہی فوجوں کے ساتھ جنگ ہوئی۔ راجہ جام کا طرز عمل خانخاناں کے ساتھ بھی ٹھیک نہیں رہا کیوں کہ وہ خود اپنی حکومت قائم کرنے کا خواہاں تھا۔ مگر خانخاناں کو اس کے ارادوں کا پتہ چل گیا اور خانخاناں نے اسے بھی سبق سکھایا۔ مظفر پھر اس جنگ میں ہار گیا۔ اور اس کے بعد سلطان مظفر کی طاقت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

عبدالرحیم خانخاناں نے عہد کیا تھا کہ مظفر پر فتح حاصل کرنے کے بعد جنگ سے حاصل تمام سازِ و سامان اور دولت غریبوں اور ضرورتمندوں میں تقسیم کر دے گا۔ اس نے کچھ افسروں کو مقرر کیا کہ وہ مال کی قیمت آنک کر اس

کے برابر روپیہ سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ کہا جاتا ہے کہ (بحوالہ بدایونی) یہ سب ڈھونگ تھا۔ خانخاناں نے اپنے چہیتے وفادار امرا کو کہا کہ مال کی قیمت لگا دو اور روپیہ بانٹ دو۔ ان وفاداروں نے اونے پونے داموں مال کی قیمت لگائی۔خود بھی بہت سے مال پر قبضہ کر لیا اور ضرورت مندوں کو برائے نام ہی ملا۔ اکبر نے جب جانا بیگم سے پوچھا تھا کہ باپ نے کتنا لٹایا تو بیٹی نے جواب دیا ستر لاکھ۔ یہ قصہ بہت مشہور ہے۔

اخیر میں ایک سپاہی آیا جس نے کہا کہ اسے کچھ نہیں ملا۔ خانخاناں کے پاس ہیرے جواہرات جڑا ہوا ایک قلمدان رہ گیا تھا۔ وہ بھی اس نے اس سپاہی کے حوالہ کر دیا۔ اس فتح اور اس کی فراخدلی کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس خوشی میں رحیم نے سرخیج 9 کے مقام پر ایک باغ بھی لگوایا۔ جس کا نام باغ فتح رکھا۔

اس جنگ کے دوران خانخاناں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ بہت سے بزرگ امرا تھے۔ جنہیں یہ شکایت رہتی تھی کہ خانخاناں ان کی خاطر خواہ عزت نہیں کرتا اور انہیں ان کے مرتبہ کے مطابق انعام و اکرام بھی نہیں دیتا۔ خانخاناں نے ان کی شکایات سنیں اور انہیں خلعت و انعام سے نوازا۔ اپنے زمانہ گجرات میں کبھی کبھی وہ ان بزرگوں کی ریشہ دوانیوں سے اس درجہ پریشان ہو جاتا کہ آگرہ واپس جانے کے بارے میں سوچتا۔ ابوالفضل سے اس کی خط و کتابت رہتی تھی۔ ان خطوں میں وہ اپنی پریشانیوں اور واپس بلانے کا ذکر کرتا ہے۔ ابوالفضل سے بادشاہ کے سامنے سفارش کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ ایک خط میں اس نے لکھا کہ وہ بادشاہ سے کہہ کر کم از کم ٹوڈرمل کو گجرات بھجوا دے جو اس کا دوست تھا۔

گجرات کی فتح کے چھ ماہ بعد ۱۵۸۵ء میں رحیم کو واپس دربار میں طلب کر لیا گیا اور گجرات میں قلیج خاں کو جانشین بنا کر وہ بہت تیز رفتاری

سے فتح پور سیکری پہنچ کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

اکبر باشاہ اسے پنجاب کی مہم پر لے گیا جہاں کابلی پریشانی کھڑی کر رہے تھے۔ سرائے آباد میں راجہ ٹوڈرمل کے بنائے ایک تالاب پر انہوں نے کچھ دن قیام کیا۔ یہاں خانخاناں نے بادشاہ سے پھر گجرات جانے کی اجازت مانگی۔ جہاں پر مظفر گجراتی نے پھر سے اپنی طاقت مجتمع کر لی تھی اور وہ احمد آباد پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ راجہ جام اس کا ساتھ دے رہا تھا اور اس نے مظفر کو پہلے جوناگڑھ پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا۔ شاہی فوجوں کو جب اس سازش کی اطلاع ملی تو وہ وہاں پہنچی اور مظفر فرار ہونے پر مجبور ہوا۔

اس بارے میں خانخاناں کو مظفر گجراتی کے علاوہ کئی مقامی راجاؤں جیسے جام اور جالور کے غزنی خان سے بھی مقابلہ تھا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ جالور کے راجہ غزنی خاں نے خانخاناں کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ اپنے وعدہ پر قائم نہیں رہا۔ وہ دو عملی سے کام لے رہا تھا۔ خانخاناں کو اس کے منصوبوں کا بخوبی علم تھا۔ چنانچہ اس نے غزنی خاں کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا اور جب غزنی خاں خانخاناں کے پاس آیا و شاہی سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ شاہی قیدی تھا اس لیے خانخاناں نے اسے چاندی کی زنجیروں میں جکڑا اور جالور پر قبضہ کر لیا۔

خانخاناں کی کوششوں سے اب گجرات میں امن قائم ہوگیا تھا۔ بادشاہ نے اسے واپس بلانے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے لکھا ''چونکہ گجرات اب پر امن ہے۔ اس لیے سپہ سالار خانخاناں کو چاہئے کہ واپس دربار میں آجائے اور صوبہ کے معاملات کو عزالدولہ، قلیج خاں اور خواجہ نظام الدین احمد کے حوالہ کر دے۔ یا اگر وہ مناسب خیال کرے تو خود وہاں رہے اور قلیج خاں اور نظام الدین احمد کو دربار میں بھیج دے۔ خانخاناں پہلے ہی گجرات سے اُکتا

چکا تھا۔ قلیج خاں کو اپنا نائب مقرر کر کے ۱۵۸۷ء میں واپس دارالخلافہ آ گیا اور پھر اس نے گجرات کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ بعد میں مرزا عزیز کوکلتاش خان اعظم کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔

مظفر گجراتی کا عبرتناک انجام ہوا اس نے ضلع نوائے نگر کے ایک چھوٹے سے گاؤں دھرول کے مقام پر ۱۵۹۳ء میں خود اپنی گردن کاٹ کر خودکشی کر لی اور اس طرح ایک نہایت بہادر اور باہمت جنگجو کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

## سیر و سیاحت

اکبر کشمیر کی سیاحت کے لیے گیا جو اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ اس سفر میں خانخاناں اور شہزادہ مراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ کشمیر میں اکبر نے فطرت کے لازوال حُسن کو دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ حرم کی خواتین بھی اس کے ساتھ ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ خانخاناں اور شہزادہ مراد کو خواتین کو لینے بھیجا۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے راستے خراب تھے اور خواتین نہ آ سکیں۔ بادشاہ بددل ہوا۔ بادشاہ کی خواہش پر خانخاناں تنہا پھر گیا اور بڑی مشکلات کے ساتھ بادشاہ کی خواہش کو پورا کیا۔

کشمیر سے واپسی پر اکبر کابل گیا جہاں اس نے دو ماہ سیر سیاحت میں گزارے۔ تاریخی مقامات اور باغوں کی سیر کی جو اس کے دادا بابر کی یادگار تھے۔ بابا کے مزار کی بھی زیارت کی۔ خانخاناں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اسی سفر میں خانخاناں نے واقعات بابری (تزک) کا ترکی زبان سے فارسی میں ترجمہ مکمل کیا اور جب بادشاہ نے ہندستان واپسی پر بارک آباد مقام پر پڑاؤ کیا تو اس کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور خانخاناں کی بڑی تعریف کی۔

اسی دوران ۱۵۸۹ء میں ٹوڈرمل کا نتقال ہوا تو بادشاہ نے خانخاناں کو اس کی جگہ وکیل سلطنت مقرر کیا۔ دراصل اب یہ عہدہ ایک اعزازی عہدہ تھا اس کا باپ بیرم خاں جب وکیل تھا تو وہ ایک بااختیار وزیر اعظم تھا۔ اکبر کے زمانہ میں وزارت عظمیٰ نمائشی اور اعزازی رہ گئی تھی اور انتظامی معاملات وکیل کے ہاتھوں میں نہیں ہوتے تھے۔ یہ نہیں معلوم کہ خانخاناں جیسے فعال سپہ سالار کو یہ عہدہ دے کر بادشاہ نے اسے سزادی تھی یا عزت افزائی کی تھی۔ یہ عہدہ بھی اس کے پاس چند ماہ سے زیادہ نہیں رہا۔ اس عہدہ سے الگ کر کے اسے جونپور کی جاگیر کا انتظام سپرد کیا گیا جہاں وہ کچھ عرصہ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہیں گوسوامی تلسی داس سے اس کی ملاقات ہوئی جس کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے۔

# مرزا برداران

حکومت کے ابتدائی زمانہ میں مرزاؤں کی بغاوت سے اکبر اعظم کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ مرزا برداران امیر تیمور کی اولاد میں سے تھے۔ اور اکبر کے رشتے کے بھائی۔ ان میں محمد سلطان مرزا اور اسکندر مرزا کو سنبھل سکرار میں اعظم پور کی جاگیر گزارے کے لیے دی ہوئی تھی۔ محمد سلطان مرزا کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک ابرہیم حسین مرزا کی شادی اکبر کے حقیقی بھائی کامران مرزا کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اکبر ان سے محبت و عزت سے پیش آتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ بغاوت پر آمادہ رہتے تھے اور سازشیں کرتے رہتے تھے۔ آخر کار اسکندر مرزا اور سلطان محمد مرزا نے سنبھل کے اطراف میں اعلان بغاوت کر دیا۔ وہ سنبھل سے گجرات کی جانب بڑھے۔ مغل فوجوں نے ان کا پیچھا کیا نربدا کے کنارے پر جنگ ہوئی۔ مرزا ہار گئے اور راہ فرار اختیار کی۔ چمپانیر کے قلعہ پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضے میں کیا۔

اسی دوران جھجھر خاں حبشی نے گجرات کے صوبیدار چنگیز خاں کو اس وقت قتل کر دیا جب وہ تریپولی (احمد آبا شہر کے تین دروازے) سے گزر رہا تھا۔ جھجھر خاں اور چنگیز خاں گجرات کے بعد کے سلطانوں کے امرا میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ مرزا صاحبان نے گجرات میں بدامنی کو دیکھ کر یہ موقع غنیمت جانا اور گجرات میں داخل ہو گئے۔ اکبر بادشاہ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو وہ بھی اپنے سترہویں سال اجلاس میں گجرات کے لیے روانہ ہوا۔ جب وہ سروہی پہنچا تو

وہاں کا راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا مگر اس کے ستر جاں نثار راجپوت جو مچھ توڑ (وہ جو موچھوں کو مروڑ سکتا ہو) کہلاتے تھے قلعہ سروہی کے دروازے پر مقابلہ کرتے کرتے مارے گئے۔ جمعہ کے دن احمد آباد میں دریا کے کنارے بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ احمد آباد کو جان اعظم کے سپرد کر کے اکبر بادشاہ ابراہیم حسین مرزا کو ختم کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اسی دوران اطلاع ملی کہ ابراہیم حسین مرزا نے اپنے غرور میں رستم خاں رومی کو قتل کر دیا اور شاہی خیمہ سے صرف آٹھ کوس دوری پر پڑاؤ ڈالے ہے۔ باشاہ نے حکم دیا کہ سورت سے شہباز خاں کمبھو، سید احمد بارہہ، شاہ قلی خاں محرم وغیرہ اپنی فوجوں کے ساتھ واپس لوٹ آئیں اور شاہی فوجوں کی مدد کریں۔

بادشاہ کی طاقت کم تھی مگر خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے صرف چالیس گھوڑسواروں کے ساتھ راتوں رات مہندی (ماہی) دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر قصبہ سرنال میں ابراہیم حسین مرزا نے پڑاؤ کیا۔ مان سنگھ کچھواہا ہراول دستہ کا سردار مقرر کیا گیا۔

باوجودیکہ بادشاہ کے ہمراہ صرف سو آدمیوں کی جمعیت تھی، رات کی تاریکی میں بلا جھجھک بادشاہ نے دریا کو پار کر لیا۔ دونوں حریفوں میں مقابلہ ہوا۔ مگر ابراہیم حسین مرزا جم نہ سکا اور میدان جنگ چھوڑ بھاگا۔ فاتح شاہی فوجیں آگے بڑھیں اور سورت کے قلعے پر قبضہ جما لیا۔ اس سے پہلے کہ شاہی فوجیں انہیں گرفتار کریں۔ ابراہیم حسین مرزا کی بیوی اور مرزا کامران کی بیٹی گل رخ بیگم اپنے بیٹے اور پانچ سو کنیزوں کے ہمراہ دکن کے لیے روانہ ہو گئیں۔ مرزا صاحبان نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ ابراہیم مرزا کو ہندوستان جا کر علم بغاوت بلند کرنا چاہیے۔ دوسرے مرزاؤں نے شیر خان فولادی سے مل کر پٹن پر قبضہ کر لیا۔ خان اعظم نے ان سے جنگ کی، قطب الدین محمد خاں کا خیمہ تباہ ہو گیا اور شیخ محمد بخاری جنگ میں مارا گیا۔ مگر اس کے باوجود شاہی فوجوں کو فتح حاصل ہوئی۔

ابراہیم حسین ملتان کی جانب فرار ہوگیا جہاں اس کا انتقال ہوگیا۔ محمد حسین مرزا دکن چلا گیا۔

مگر محمد حسین مرزا نے پھر سر اٹھایا اور وہ گجرات کی طرف بڑھا۔ سورت کے قلعہ پر حملہ کیا۔ لوٹ مار کرتا ہوا کھمبات پہنچا جہاں شاہی فوجوں سے جنگ ہوئی۔ اختیار الملک کے پاس گیا اور دنوں نے مل کر کثیر فوج جمع کی ایدر کے راجہ سے سمجھوتہ کیا اور احمد آباد میں خان اعظم اور قطب الدین خان کو محصور کر لیا۔ خان اعظم نے اس صورت حال سے بادشاہ کو مطلع کیا۔ چنانچہ اکبر بادشاہ ۲۳ اگست ۱۵۷۳ء کو ایک تیز رفتار اونٹنی (بختی جس کے دو کوہان ہوتے ہیں) پر سوار ہوکر معین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دی۔ کچھ دیر آرام کیا اور پھر کوچ کیا۔ عبدالرحیم خانخاناں، زین خاں کوکا، سیف خاں کوکا، خواجہ عبداللہ جیسے جنگجو بادشاہ کے ہم رکاب تھے۔ بادشاہ دیسہ پہنچا جو پٹن سے بیس کوس کے فاصلے پر ہے۔ اس مقام پر اکبر بادشاہ نے قیام کیا اور اس مہم کی تفصیلات بتلائیں اور اردگرد کے زمینداروں اور باج گزاروں کو جمع کیا۔ یہاں پر عبدالرحیم خانخاناں کو فوج کے ہراول دستہ کا سردار مقرر کیا گیا۔ سید محمود بارہہ اور شجاعت خاں کو میمنہ و میسرہ پر تعینات کیا۔ باشاہ نے پشت پر فوجوں کی کمان سنبھالی تاکہ وہ تمام فوجوں پر نظر رکھ سکیں اور جہاں کمزوری نظر آئے اس کی مدد کے لیے دوڑیں۔

بادشاہ کے خیمہ میں کل تین ہزار گھوڑ سوار تھے جبکہ مرزا کی فوج میں بیس ہزار گھوڑ سوار شامل تھے۔ اس فوج کے ساتھ اکبر باشادہ احمد آباد پہنچا۔ فتحپور سیکری سے احمد آباد تک کا یہ سفر صرف نو دن میں طے کیا جو بذات خود ایک زبردست کارنامہ ہے۔

بادشاہ نے سکندر قراول کے ذریعہ خان اعظم کو اپنی آمد کے بارے میں اطلاع بھیجی۔ محمد حسین مرزا کے سپاہی باشاہ کی آمد سے غافل نشہ کی حالت میں سوئے پڑے تھے۔ باشاہ نے کہا کہ بے خبر اور مدہوش سپاہیوں پر حملہ کرنا بہادری

نہیں ہے۔ اس لیے انہیں چوکنا ہونے کا موقع دیا گیا۔ بہرحال محمد حسین مرزا کی فوجوں کو تیاری کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ پَو پھٹتے ہی جنگ شروع ہوئی۔ مرزا جنگ ہار گیا۔ زخمی حالت میں مرزا کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ مرزا نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ مٹی کے پیالے میں پانی دیا گیا۔ مرزا نے ہاتھ مار کر پانی زمین پر گرا دیا۔ بادشاہ نے خود اپنی چھاگل سے پانی پیش کیا جو مرزا نے پی لیا۔

بادشاہ نے مرزا کی تادیب کی۔ نصیحت کر کے اسے رائے سنگھ کے سپرد کردیا۔ اس جنگ میں اختیار الملک کو قتل کردیا۔ بعد میں جب اختیار الملک کے سپاہیوں نے رائے سنگھ کی فوجوں کا پیچھا کیا تو راجپوتوں نے محمد حسین مرزا کو بھی قتل کردیا۔ دو ہزار سپاہی اس جنگ میں مارے گئے۔ بادشاہ نے ان سروں کا مینار بنانے کا حکم دیا تاکہ دوسروں کو نصیحت ہوسکے۔ اختیار الملک اور محمد حسین مرزا کے سر اکبر آباد بھیج دیے گئے۔

اُدھر گلرخ بیگم نے دکن جاتے ہوئے راستہ میں فتنہ و فساد برپا کیا۔ اسیرِ مالوہ کے صوبیدار راجہ علی خان فاروقی سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ فاروقی کے ہاتھوں بیگم کو شکست ہوئی۔ اس کا بیٹا مظفر حسین مرزا اور پوتا دربار میں بلا لیے گئے جہاں بادشاہ نے اپنی بڑی بیٹی شہزادہ خانم کو مظفر حسین کے نکاح میں دے دیا اور اس کی بہن کی شادی شہزادہ سلیم سے کردی۔ اسے منصب و جاگیریں عطا کی گئیں مگر پھر بھی وہ (مظفر حسین) سازشوں سے باز نہیں آیا۔ بعد میں اکبر آباد میں ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ 10

☆☆

# سندھ میں معرکہ آرائیاں

کابل و قندھار سے مغلوں کا سیاسی رشتہ منقطع ہو چکا تھا اگرچہ وہ ان علاقوں کو ابھی بھی ممالک موروثی سمجھتے تھے اور چاہتے تھے ان کے قبضے میں آجائیں اور بعد میں اکبر کابل و قندھار کو سلطنت مغلیہ کا حصہ بنانے میں کامیاب بھی ہوگیا۔ قندھار خاص طور پر ہندستان کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔اس لیے اس پر تسلط ایک سیاسی ضرورت بھی تھی۔ اکبر جب تک سلطنت کے داخلی معاملات میں گھرا رہا اس نے شمال سرحدی علاقوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ اب اسے فرصت نصیب ہوئی تو اس نے اس طرف توجہ دی۔ مغلوں کی جہاں بانی اور جہاں رانی کی فطری تمنا بھی ایک سبب تھی۔ اکبر کو بہانہ بھی مل گیا تھا۔

مرزا محمد باقی ترخان سندھ کا حکمراں تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا پوتا مرزا جانی بیگ اس کا جانشین مقرر ہوا۔ ترکھان ان کا لقب تھا۔ ارغون قبیلہ سے ان کا تعلق تھا اور چنگیز خاں سے اپنا نسلی رشتہ جوڑتا تھا۔ مرزا جانی بیگ ترخان آزادانہ طبیعت کا مالک تھا اور شاہی دربار کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔ بادشاہ کے حکم کے باوجود اس نے کبھی دربار میں حاضری نہیں دی جبکہ اس کے باپ دادا مغلوں کے مطیع و فرمانبردار رہتے تھے۔ مرزا جانی بیگ سے ایک شکایت اور بھی تھی۔ اس نے ہمایوں کو بہت تنگ کیا تھا۔ اکبر نے اسے سبق سکھانا ضروری سمجھا اور ایک بار پھر اس مہم کے لیے عبدالرحیم خانخاناں کا انتخاب کیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اکبر خانخاناں کو پہلے قندھار فتح کرنے کے لیے بھیجنا

چاہتا تھا مگر خانخاناں وہاں جانے کے لیے تیار نہیں تھا اور وہ جب بادشاہ کے مجبور کرنے پر جانے کے لیے تیار ہوا تو راستہ میں سندھ ہی میں الجھ کر رہ گیا اور قندھار نہیں جا سکا۔ تاہم سندھ کی اس مہم کا آغاز جنوری ۱۵۹۰ء میں ہوا۔ ٹھٹھہ ایک تاریخی اور بارونق شہر تھا جو سندھ کا دروازہ بھی تھا جنگ کا پہلا نشانہ بنا۔ ٹھٹھہ ہی میں جنگ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ شاہ ایران اور قندھار کے مرزاؤں کی جانب سے اکبر کی خدمت میں صلح کے پیغام پہنچے جس کی وجہ سے بادشاہ نے رحیم کو ٹھٹھہ ہی میں جنگ کرنے کا حکم دیا۔ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ خانخاناں نے زیادہ مال غنیمت ملنے کی وجہ سے قندھار کی بجائے ٹھٹھہ ہی کو اپنا نشانہ بنایا۔

خانخاناں بڑی شان و شکوت کے ساتھ لاہور سے روانہ ہوا۔ بادشاہ خود ایک منزل تک براستہ دریا اسے رخصت کرنے کے لیے آیا۔ بادشاہ نے اسے بلوچستان پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ خانخاناں نے سیدھا اور مختصر راستہ اپنانے کی بجائے لمبا راستہ اختیار کیا جو ملتان اور بھکر سے گزرتا تھا۔ یہاں اس نے بادشاہ کی مرضی کے خلاف اپنے جنگی منصوبہ میں تبدیلی کی اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کیا۔ اس کے علاوہ خانخاناں یہ بھی چاہتا تھا کہ قندھار پر حملہ کرنے سے پہلے اس کے پاس کچھ اور ساز و سامان، دولت اور فوج جمع ہو جائے اور قندھار کے تئیں اس کی بددلی بھی ایک وجہ تھی کہ اس نے جان بوجھ کر سندھ میں معرکہ آرائی کو طول دیا ہوگا۔

خانخاناں جب ٹھٹھہ کے مقام پر پہنچا تو مرزا جانی بیگ کے سفیر خیر سگالی کا پیغام لے کر اس کے پاس حاضر ہوئے مگر خانخاناں نے صلح جوئی کی بجائے مقابلہ کا راستہ اپنایا اور مرزا کے سفیروں کو قید کر لیا۔

سندھ میں گجرات کے مقابلہ میں منظرنامہ مختلف تھا۔ یہاں زیادہ دشواریاں تھیں۔ خانخاناں یہاں کے جغرافیائی اور سماجی حالات سے ناواقف نہ تھا۔

پھر یہ کہ اس جنگ میں پہلی بار دریائے سندھ میں کشتیوں اور جہازوں کا استعمال کیا گیا۔ خانخاناں کو کئی بار پسپائی کا سامنا کرنا پڑا اور کئی بار بادشاہ سے کمک اور مدد مانگنی پڑی۔ بادشاہ نے لاکھوں روپیہ اور لاکھوں من جنس فوج کے لیے روانہ کی۔ یہاں خانخاناں کو طوفان باد و باراں کا بھی سامنا کرنا پڑا اور ایک غیر ملکی طاقت پرتگالیوں سے بھی نبرد آزمائی کرنی پڑی۔

پہلے حملہ میں خانخاناں نے لکھی کو تو حاصل کرلیا جو سندھ کی فتح کی کنجی سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں لکھی کو خاص جغرافیائی اور جنگی حیثیت حاصل تھی جس طرح کشمیر کے لیے بارہ مولا یا بنگال کے لیے گڑھی تھے اسی طرح لکھی کا درجہ سندھ کا دروازہ تھا۔ اصل معرکہ تو سہوان یا لیوان کے مقام پر ہوا جہاں ایک جنگی قلعہ تھا۔ خانخاناں نے اس کا محاصرہ کیا۔ قلعہ پہاڑی پر واقع تھا۔ اس کے چاروں طرف چالیس گز خندق تھی جو پانی سے بھری رہتی تھی۔ سات گز چوڑی فصیل بنی تھی۔ دریا سندھ کی تین شاخیں یہاں آکر ملتی تھیں جنھوں نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ قلعہ کیا تھا ایک جزیرہ تھا۔ اس قلعہ کا فتح کرنا لوہے کے چنے چبانا تھا۔ خانخاناں کو کئی بار شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مرزا جانی بیگ کا بحری بیڑا بھی بڑا مضبوط تھا۔ اس کے پاس بارہ ہزار گھوڑ سوار تھے۔ سو کے قریب سمندری جہاز تھے جنہیں غراب کہا جاتا تھا۔ دو سو کشتیاں تھیں جن میں تیر انداز اور بندوقچی سوار تھے۔ خانخاناں کے ساتھ جہاں آزمودہ کار مغل جنگجو تھے، صرف بارہ سو گھوڑ سوار تھے۔ کچھ غراب اور کشتیاں تھیں ۔ جن میں بعد میں اضافہ ہوا۔ مغل ہمیشہ کم فوج کے ساتھ بڑی فوج پر فتح پاتے رہے تھے۔ اس کی وجہ ان کی اقبال مندی اور بلند حوصلگی تھی۔ یہ جنگ بھی خانخاناں نے جیت لی۔ سہوان کا قلعہ بھی اس کے قبضہ میں آگیا اور مرزا جانی فرار ہونے پر مجبور ہوا۔ گجرات میں جس طرح مظفر گجراتی بار بار پسپا ہو کر بھی پھر سر اُبھارتا تھا۔ یہی صورت سندھ میں مرزا جانی کی تھی۔ اسے بھی عوام کی حمایت حاصل تھی۔ غالباً مغلوں کو غیر ملکی سمجھا جاتا تھا اور

یہ مقامی حکمراں تھے، علاقائیت اس زمانہ میں بھی ایک فیکٹر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اگر طوفان باد و باراں نہ آگیا ہوتا اور مرزا جانی کے تمام راستے بند نہ ہوگئے ہوتے تو اس کو شکست نہ ہوتی، یہ جنگ وہ جیت جاتا۔

سیہوان کی یہ جنگ ڈیڑھ سال تک جاری رہی جس میں فریقین کا بے شمار جانی و مالی نقصان ہوا۔ روزانہ جنگ ہوتی تھی اور ہر روز سیکڑوں آدمی مارے جاتے تھے کبھی کبھی رسد کی اس درجہ کمی ہوجاتی تھی کہ مردہ گھوڑوں کا گوشت کھانا پڑتا تھا۔ راجہ ٹوڈرل کا بیٹا، دھارو بھی اس جنگ میں شریک تھا اور وہ لڑتے لڑتے مارا گیا۔ مرزا جانی آخر کار صلح کرنے پر مجبور رہوا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ صلح کے معاہدہ پر دستخط کرنے سے پہلے اس نے اپنے باپ مرزا پاندہ بیگ اور بیٹے مرزا فتح کو لکھا کہ وہ ٹھٹھہ شہر کو قطعی مسمار کردیں اور اپنے خاندان کے افراد اور عوام کو کلاں کوٹ بھیج دیں۔ یہ شہر جو قلعہ بند تھا اسی مقصد کے لیے بنوایا تھا۔ اسی دوران مرزا جانی کے باپ اور بیٹے دونوں کا انتقال ہوگیا۔ مرزا جانی کے سامنے سوائے صلح کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے حکم جاری کیا کہ تمام قلعوں کی چابیاں خانخاناں کے سپرد کردی جائیں۔

۱۷ر اگست ۱۵۹۱ء کو محاصرہ اٹھا لیا گیا جو جنوری ۱۵۹۰ء میں شروع ہوا تھا یعنی پورے ڈیڑھ سال بعد۔ خانخاناں نے مکمل رپورٹ باشادہ کی خدمت میں ارسال کی۔ خانخاناں نے کچھ عرصہ سہوان کے قریب ایک گاؤں میں قیام کیا اور پھر ٹھٹھہ کے لیے روانہ ہوا۔ سردی کا آغاز ہوچکا تھا۔ جب مغل فوجیں فتح باغ پہنچیں تو مرزا جانی بیگ خانخاناں کے استقبال کے لیے وہاں پہنچا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ صلح کی شرطیں طے ہوئیں۔ شرطوں کے مطابق مرزا جانی کو اپنی ایک بیٹی کی شادی خانخاناں کے بیٹے مرزا ایرج کے ساتھ کرنی پڑی اور خونریز جنگ کے بعد شادی کے شادیانے بج اُٹھے۔ سہوان کا قلعہ بھی مغلوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ مرزا جانی مغل دربار میں حاضری دے گا اور معاہدہ کی

چوتھی شرط کے مطابق بیس جنگی جہاز (غراب) بھی خانخاناں کو دے دیے گئے آخرکار سندھ میں ترخانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور انہوں نے مغلیہ سلطنت کے ایک صوبیدار کی حیثیت قبول کرلی۔

ہندستان کی یہ پہلی بحری جنگ تھی جس میں سمندری جہازوں کا استعمال کیا گیا اور یہ پہلی جنگ تھی جس میں کسی یورپی طاقت نے حصہ لیا تھا۔ خلیج فارس میں ہرمز بندرگاہ میں پرتگالی بیڑے موجود رہتے تھے۔ سندھ میں پرتگالیوں کا ایک ایجنٹ مستقل قیام پذیر تھا جو اس علاقہ میں اپنے تجارتی مفادات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس ایجنٹ نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا۔ ابھی تک ان لوگوں کی سرگرمیاں تجارت تک محدود تھیں۔ سندھ میں پہلی بار انہوں نے سیاست میں حصہ لیا۔ اس سے ان کی بڑھتی طاقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کو یہ بھی ڈر تھا کہ مغلوں کے تسلط سے ان کی تجارت کو نقصان پہنچے گا۔ اکثر ان کے خلاف مغل دربار میں شکایتیں پہنچتی رہتی تھیں۔ اکبر نے کئی بار تادیبی کارروائی بھی کی۔ اسی لے پرتگالیوں نے مرزا جانی کا ساتھ دیا۔ مرزا جانی ان کی طاقت پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔ معاہدہ کی رو سے اسے مغل دربار میں حاضر ہونا تھا مگر وہ نہیں گیا۔ اسے یہ امید تھی کہ پرتگالیوں کی مدد سے وہ ایک دن مغلوں کو مار بھگائے گا۔

لیکن آخرکار وہ دربار میں حاضر ہونے پر مجبو رہوا۔ بادشاہ کی دلی خواہش پوری ہوئی۔ شاید بادشاہ اس کی ذاتی خوبیوں سے متاثر بھی رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ مرزا جانی چغتائی ونش سے تعلق رکھتا تھا۔ دربار میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اس ے پنج ہزاری منصب دار بنایا گیا۔ ملتان اور ٹھٹھہ اسے واپس کردیے گئے اور وہ اب باقاعدہ امرا میں شامل ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دین الٰہی بھی قبول کرلیا تھا۔ اسے دکن کی مہم پر بھی بھیجا گیا جہاں جنوری ۱۶۰۱ء میں برہان پور کے مقام پر دماغ کی رگ پھٹ جانے سے انتقال ہوگیا۔ جس کی وجہ کثرت شراب نوشی تھی۔

مرزا محمد جانی ایک بہادر سپہ سالار کے ساتھ ایک عالم، ادیب اور شاعر بھی تھا۔ موسیقی سے دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ مہذب اور سنجیدہ انسان تھا۔ بچپن سے شراب کی لت میں مبتلا تھا۔ خوبی یہ تھی کہ شراب پی کر بہکتا نہ تھا۔ کوئی بیہودہ حرکت بھی نہ کرتا۔ اگرچہ کثرت سے شراب پیتا تھا۔ دوسرے وہ کسی کے سامنے نہیں بلکہ گوشہ تنہائی میں پیتا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کی جاگیر اس کے بیٹے محمد غازی کو دے دی گئی۔

ملا شکیبی، عبدالرحیم خانخاناں کے دربار کا ایک مشہور شاعر تھا۔ اس نے سندھ کی جنگ پر ایک مثنوی لکھی تھی جس کا ایک شعر تھا:

ہمائے کہ بر چرخ کردی خرام

گرفتی و آزاد کردی زدام

(ہما جو آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر رہا تھا، اسے پکڑ تو لیا مگر پھر آزاد بھی کر دیا۔)

اشارہ مرزا جانی کی طرف تھا۔ یہ مثنوی شکیبی نے ایک محفل میں پڑھ کر سنائی جس میں خانخاناں اور مرزا محمد جانی دونوں موجود تھے۔ خانخاناں نے ایک ہزار اشرفیاں انعام میں شاعر کو پیش کیں۔ مرزا جانی نے بھی ایک ہزار اشرفیاں شاعر کو دیں۔ یہ بات دربار کے آداب کے خلاف تھی۔ کسی کی محفل میں دوسرے شخص کا انعام دینا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مرزا جانی کے اس اقدام پر لوگوں نے سوال کیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ مرزاجانی نے جواب دیا۔ شاعر نے اسے ہما کہا تھا اگر وہ اسے اُلو کہہ دیتا تو اسکا کیا کر لیتا۔ اس لیے اس نے بھی اسے انعام دینا ضروری سمجھا۔ گجرات اور سندھ کی جنگوں نے خانخاناں کو پختہ کار سپہ سالار بنا دیا تھا۔ اب ان سے بھی بڑا معرکہ اس کا منتظر تھا۔

☆☆

# خانخاناں دکن میں

## پہلا مرحلہ

وندھیاچل اور نربدا کے جنوب میں پھیلا ہوا ہندوستان دکن کہلاتا ہے۔ دکن ابتدا سے مسلم حکمرانوں کی توجہ کا مرکز رہا۔ جہاں بانی کی خواہش نے علاء الدین خلجی کو دکن پر حملہ کرایا۔ اس کا سپہ سالار ملک کافور جنوبی ہند کے آخری کنارے مدورائے تک پہنچ گیا تھا۔ محمد بن تغلق نے تو جنوبی ہند کے بیشتر علاقہ کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا تھا۔ میسور اور مالابار تک پر اس کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔

مگر دہلی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے پر دکن میں چھوٹی چھوٹی خود مختار اور آزاد ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔ احمد نگر دکن کی سب سے زیادہ بڑی اور طاقتور ریاست تھی جس پر نظام شاہی خاندان حکمراں تھا۔ بیجاپور جو احمد نگر کے جنوب میں واقع ہے نسبتاً چھوٹی ریاست تھی۔ ۱۴۸۹ء میں اسے یوسف عادل شاہ نے قائم کیا تھا۔ اس ریاست کے حکمراں عادل شاہی کہلاتے تھے۔ گولکنڈہ کو ایک علیحدہ ریاست بنا دیا تھا۔ یہ ریاست کرشنا اور گوداوری کے بیچ اوراڑیسہ تک پھیلی ہوئی تھی۔اس ریاست کے حکمراں قطب شاہی کہلاتے تھے چوتھی ریاست بیدر تھی جس پر بہمنیوں کا قبضہ اور جو بیدر شاہی کہلاتی تھی۔ جو متذکرہ بالا تینوں ریاستوں سے چھوٹی تھی۔ یہ گولکنڈہ اور بیجا پور کے بیچ میں واقع تھی۔ دکن کی پانچویں ریاست

برابر تھی جو بہمنی سلطنت کا حصہ تھی مگر ایک سردار فتح اللہ شاہ نے بہمنیوں سے لڑکر اسے آزاد کرالیا تھا۔ یہ گوداوری دریا کی معاون ندیوں کے درمیان واقع تھی۔

پانچوں ریاستوں میں اوّل دو ریاستوں، احمد نگر اور بیجا پور کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ یہ دونوں سب سے بڑی ریاستیں بھی تھیں۔ دکن کی یہ پانچوں ریاستیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ اکبر یہاں امن و امان قائم کرنا چاہتا تھا لیکن دکن پر اس کے حملہ کی یہ وجہ نہ تھی۔ شمال و مغرب کا جب بیشتر حصہ اس کے زیرنگیں آگیا تو اسے دکن کا خیال آیا۔ اکبر کی سلطنت کو وسیع تر کرنے کی خواہش دکن میں اس کی دخل اندازی کی واحد وجہ نظر آتی ہے۔ آنے والے مغل بادشاہوں نے اکبر کی اس پالیسی کو کسی نہ کسی حد تک جاری رکھا۔ اورنگ زیب کی زندگی کے ۲۵ سال دکن میں ہی گزر گئے۔ دیکھا جائے تو بہت سے عوامل میں مغلوں کی دکنی پالیسی مغل سلطنت کے زوال کا اک اہم سبب تھی۔ احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ حکمراں تھا۔ ۱۵۸۸ء میں خود اس کا بیٹا میران حسین باپ کو قتل کر کے تخت نشیں ہوا۔ مگر چند ماہ بعد اسے بھی قتل کر دیا جاتا ہے اور برہان الملک کے بیٹے اسماعیل کو گدی پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ برہان الملک، مرتضیٰ نظام شاہ کا بھائی تھا، برہان الملک کو اکبر بادشاہ دربار میں بلاتا ہے اور دکن میں اپنا اثر قائم کرنے کے لیے اس سے دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ یہاں سے اکبر کی دکن پالیسی کا آغاز ہوتا ہے۔ اکبر نے سوچا کہ اگر برہان الملک مغل فوجوں کی مدد سے احمد نگر کا حکمراں بن جاتا ہے تو وہ اکبر کا خراج گزار رہے گا اور وہ اس کی مدد سے دکن کی دوسری ریاستوں پر اپنا تسلط قائم کر سکے گا۔ اکبر نے برہان الملک کی مدد کی اور وہ احمد نگر کا حکمراں بن گیا۔ مگر اکبر کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بادشاہ بنتے ہی برہان الملک نے اکبر کی ایک نہ سنی۔ اس نے مغلوں کا تسلط تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اکبر جب اپنے اس منصوبہ میں ناکام ہوگیا تو اس نے احمد نگر اور دکن کی دوسری ریاستوں میں اپنے سفیر روانہ کیے۔ دکن پر فتح حاصل کرنے کی تیاری کا یہ دوسرا قدم تھا۔ شیخ فیضی کو احمد نگر برہان

الملک کے پاس روانہ کیا۔ برہان الملک نے فیضی کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور خوب خاطر مدارات بھی کی مگر کوئی سیاسی وعدہ نہیں کیا۔ دوسری ریاستوں میں بھیجے گئے مشن بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ کوئی ریاست بھی مغلوں کی بالادستی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

چنانچہ اکبر نے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۵۹۳ء میں اس نے ایک جنگی کونسل طلب کی جس میں شہزادہ دانیال کو دکن کی کمان سپرد کی۔ مگر بعد میں جب بادشاہ نے خانخاناں سے مشورہ کیا تو اس نے یہ ذمہ داری قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ بادشاہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اب خانخاناں کو دکن مہم کا انچارج بنا دیا۔ مالوہ کے جاگیر دار مرزا شاہ رخ۔ اجمیر کے صوبیدار شہباز خاں اور شہزادہ مراد جو گجرات کا صوبیدار تھا کو حکم دیا کہ وہ خانخاناں کی مدد کریں۔ خانخاناں کو بھلسہ کی جاگیر عطا کی گئی۔ نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ بادشاہ نے خانخاناں کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔

ادھر دکن کی ریاستیں برابر ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار تھیں۔ احمد نگر میں برہان الملک نے اپنے بیٹے ابراہیم کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ مگر اس کے سپہ سالار اخلاص خاں حبشی نے مخالفت کی اور خود اپنے بیٹے کو گدّی کا دعویدار بنایا اور برہان الملک کے خلاف بغاوت کر دی۔ برہان الملک کو خود اپنی ہی فوجوں کے خلاف لڑائی لڑنی پڑی۔ صرف چار سال حکومت کرنے کے بعد برہان الملک کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا ابراہیم نظام شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ اس کی عمر صرف تیرہ چودہ سال تھی۔ میاں منجو سلطنت کا وزیر اعظم تھا جو بادشاہ کے نام پر خود حکومت کرنے لگا۔

بیجاپور کے سلطان نے نئے بادشاہ کو مبارکباد دینے کے لیے احمد نگر اپنا سفیر بھیجا۔ خلاف معمول بیجاپور میں احمد نگر کے سفیر کی بے عزتی کی گئی۔ بیجاپور کے سلطان علی عادل شاہ نے اس بے عزتی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی اور احمد نگر پر حملہ کر

دیا۔ علی عادل شاہ اس جنگ میں مارا گیا۔ میاں منجو شکست کھا کر احمد نگر پہنچا اور وہاں برہان الملک کے پڑپوتے احمد کو جو ابھی بارہ برس کا تھا تخت پر بٹھایا۔ ابراہیم کے چھوٹے بیٹے بہادر کو جو واحد جانشین تھا جیل میں بند کردیا۔ اخلاص خاں حبشی نے احمد کو احمد نگر کا سلطان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بیجا پور میں علی عادل شاہ کی بیوہ چاند بی بی آرام سے زندگی گزار رہی تھی۔ وہ برہان الملک کی بہن تھی اور اس طرح احمد نگر کے تخت کی حقدار بھی۔ اخلاص خاں حبشی نے چاند بی بی کو بہادر کی حمایت کے لئے آمادہ کر لیا۔ اس طرح میاں منجو اور اخلاص خاں کے درمیان جھگڑا کھڑا ہوگیا منجو میاں نے شہزادہ مراد کو خط لکھا کہ وہ اس کی مدد کے لیے آئے۔ ادھر خانخاناں مانڈو میں ٹھہرا تھا۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے وہ آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا۔ مراد خانخاناں سے حسد رکھتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ سپہ سالار اس کی کمان میں دکن کی جنگ لڑیں۔ منجو میاں کا خط پاتے ہی مراد دکن کے لیے راونہ ہوا۔ اس نے خانخاناں کو اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

اُدھر خانخاناں بھلسہ میں مقیم تھا جہاں سے وہ اجین کے لیے راونہ ہوا۔ جہاں مرزا شاہ رخ اس سے آکر ملا۔ یہاں سے وہ دونوں، مانڈو کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں شہباز خاں اپنی فوجیں لے کر آگیا۔ مراد کو جب یہ اطلاعات ملیں تو وہ بہت برہم ہوا اور خانخاناں کو فوراً آنے کے لیے لکھا۔ خانخاناں نے جواب میں لکھا کہ اسے خاندیش سے مزید فوجوں کا انتظار ہے۔ یہ فوجیں ملنے پر وہ اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ مزید یہ بھی لکھا کہ اس دوران وہ شکار سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ شہزادہ اس جواب سے اور بھی چراغ پا ہوا۔ ان باتوں سے شہزادہ اور خانخاناں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع ہوگئی۔ مراد احمد آباد سے سیدھا احمد نگر بڑھ رہا تھا۔ خانخاناں مالوہ سے روانہ ہوا۔ خاندیش کا راجہ علی خاں تھا جس کی راجدھانی برہان پور تھی۔ وہ ایک بہادر اور طاقتور حکمراں تھا۔ دکن کا راستہ خاندیش سے ہوکر گزرتا تھا۔ اس لیے اس کے صوبہ کو ایک اہم جغرافیائی حیثیت حاصل تھی۔

خانخاناں نے راجہ علی خاں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ جو اس کی ڈپلومیسی کا ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے حلف وفاداری اٹھایا۔ اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکہ ڈھالیا گیا۔ خود راجہ خاں اپنی فوجوں کو لے کر خانخاناں کے ہمراہ دکن کی جانب بڑھا۔ خانخاناں نے خاندیش واپس اسے جاگیر میں دے دیا اور پنج ہزاری منصب دار مقرر کیا۔ خانخاناں نے بادشاہ کو مطلع کرتے ہوئے اپنے ان اقدامات کی توثیق چاہی۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور نہ صرف یہ کہ اس نے توثیق کر دی بلکہ خانخاناں کو مزید انعام واکرام سے بھی سرفراز کیا۔

دراصل خاندیش دکن کا دروازہ سمجھا جاتا تھا اور دکن میں کامیابی کے لیے اس علاقہ پر قبضہ ضروری تھا۔ خانخاناں اس کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ اس کے جائے وقوع پر غور کریں تو اس کی جنگی افادیت کا اندازہ ہوگا۔ اس کے ایک جانب گجرات ہے تو دوسری جانب دلّی اور تیسری جانب دکن ۔ خاندیش سے ملا مالوہ ہے۔ جس کی راجدھانی مانڈو ہے۔ خاندیش کو غیر معمولی مرکزیت حاصل ہے۔ جو اپنی غیر معمولی شادابی اور خوشگوار آب و ہوا کے لیے بھی مشہور ہے۔ اسی لیے ہمایوں کو مالوہ بہت پسند تھا اور وہ یہاں اکثر آرام کے لیے آیا کرتا تھا۔ خانخاناں کو بھی یہ جگہ بہت پسند آئی اسی وجہ سے شاید اس نے دکن کے سفر کو موخر کیا ہو اور جس کی وجہ سے مراد اس سے ناراض ہوگیا۔ خانخاناں اب مزید اختلاف کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے تیزی سے چل کر احمد نگر کے قریب شہزادہ کے سامنے حاضر ہوا۔ مغلوں میں اکثر کمان شہزادہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور سپہ سالار اس کے ماتحت ہوتا تھا۔ یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ شہزادہ اصل میں جنگ کا انچارج تھا۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ فن سپہ گری میں خانخاناں کا پلّہ بھاری تھا اور وہ ایک کمزور شہزادہ کے ماتحت کام کرنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔

شہزادہ، خانخاناں سے اس درجہ ناراض تھا کہ اس نے ملنے تک سے انکار کر دیا۔ کئی روز تک نامہ و پیام کا سلسلہ چلتا تھا۔ آخر کار شہزادہ نے سپہ سالار کو

معاف کر دیا اور حاضری کی اجازت دے دی۔

خانخاناں کی مہم کانٹوں سے بھری سیج تھی۔ مغل فوج میں بھی امرا و افسر آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ایک طرف شہزادہ اور خانخاناں کی نہیں بنتی تھی تو دوسری طرف شہباز خاں اور صادق خاں کا ایک دوسرے سے اختلاف تھا۔ راجہ علی خاں اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ شہزادہ کا رویہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ فوج کے اندر رشوت خوری عام تھی۔ دشمن کو خبریں پہنچانے کے لیے پیسہ لیتے تھے۔

چاند بی بی کے کیمپ میں بھی حالات کچھ زیادہ بہتر نہ تھے۔ لیکن چاند بی بی اپنے خلوص اور اپنی مقناطیسی شخصیت سے کسی حد تک نظم و ضبط پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس وقت چاند بی بی کی عمر پچاس برس تھی۔ وہ بیجاپور سے احمد نگر کے لیے راوانہ ہوئی اور بہادر کو رہا کرنے کے لیے کہا مگر جیلر نے منع کر دیا۔ تاہم اس نے غائبانہ طور پر اس کے نام سے اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور خود فوجوں کی کمان سنبھال لی۔ وہ ایک سنجیدہ پروقار اور غیر معمولی ہمت والی عورت تھی۔ بڑی ہوشیاری سے اس نے قلعہ کے تمام اندرونی اختلافات کو دور کردیا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ اور قلی قطب شاہ کو امداد کے لیے خطوط لکھے۔ اخلاص خاں حبشی اور ابھنگ خاں کے پاس اپنے قابل اعتماد سفیر روانہ کیے۔ اس نے کہا کہ مادر وطن خطرہ میں ہے اور اس کی حفاظت کے لیے تمام دکنی اپنے اختلافات بھول کر ایک غیر ملکی طاقت کے خلاف متحد ہوجائیں۔ اس نے حب الوطنی کے جذبات کو للکارا۔ ان کے نزدیک مغل غیر ملکی تھے۔ اس لیے زیادہ تر دکنی امرا اور سلاطین چاند بی بی کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور بھی مغلوں کے خلاف صف آرا ہوگئے۔

اسی دوران مغل فوجوں نے احمد نگر قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ مغلوں کے خلاف اس جنگ میں چاند بی بی نے جو کارنامے دکھائے وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ مغل فوجوں نے قلعہ کے چاروں طرف باردو کی سرنگیں

بچھا دی تھیں۔ چاند بی بی نے انہیں پانی میں ڈبو کر بیکار کر دیا۔ اس کے باوجود ایک خشک سرنگ باقی رہ گئی تھی جو پھٹ گئی۔ اور جس سے قلعہ کی ایک دیوار مسمار ہوگئی۔ مغل فوجیں اس ٹوٹی دیوار سے قلعہ کے اندر داخل ہونے کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ مگر چاند بی بی کی مستعدی اور ہوشیاری سے وہ اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ چاند بی بی نے راتوں رات دیوار کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ پوری فوج اس کی تعمیر میں لگا دی اور خود دیوار پر بیٹھ سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتی رہی یہ دیوار پچاس گز لمبی اور تین گز چوڑی تھی۔ جو کچھ ہاتھ لگا اس دیوار میں بھر دیا گیا۔ یہاں تک کہ سپاہیوں کی لاشوں کو بھی دیوار میں چُن دیا گیا۔ ایک ہی رات میں دیوار بن کر تیار ہوگئی۔ صبح کو مغلوں نے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ مغل اس ٹوٹے راستہ سے اندر گھس جاتے مگر انہیں ڈر تھا کہ ایک سرنگ ابھی پھٹی نہیں تھی۔ انہیں اس کے پھٹنے کا بھی ڈر تھا۔ چاند بی بی کو مغل افسروں کی باہمی رقابتوں کا بھی علم تھا۔ اس نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا۔ انہیں توڑنے کے لیے ان کے پاس رشوتیں بھجوائیں۔ وہ مغلوں کے کیمپ پر توپوں کے ذریعہ اشرفیوں کی بارش کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی ذاتی ہمت اور حوصلہ نے بھی مدد کی اور سپاہیوں کے حوصلہ کو بنائے رکھا۔ زرہ بکتر پہنے۔ چہرہ پر نقاب ڈالے اور ہاتھ میں برہنہ شمشیر لیے وہ خونخوار شیرنی کی طرح گھومتی تھی۔ اور اپنے مرحوم شوہر کے نعروں کو بلند کرتی تھی۔ اس کی سبز رنگ کی وردی ہر جگہ سے سپاہیوں کو نظر آتی تھی۔ اگلے پورے دن وہ نہایت بہادری سے لڑی۔ اس کے سپاہیوں نے مغلوں کے ہر حملہ کو ناکام بنا دیا اور گجرات سے آنے والی رسد کو بھی روک دیا جس سے مغل کیمپ میں کھانے کی زبردست قلت ہوگئی۔

دوسری طرف خانخاناں اور شہزادہ مراد میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے جنون میں آپس میں سخت اختلافات ہوگئے۔ اگرچہ خانخاناں کی کوشش تھی کہ جھگڑا نہ بڑھے۔ خانخاناں نے راجہ علی خاں کی بیٹی کی شادی شہزادہ کے

ساتھ کر دی کہ رشتہ داری سے تعلقات میں نرم گوشے پیدا ہو جائیں گے۔ خانخاناں سپہ سالار تھا اسے فیصلے لینے ہوتے تھے۔ اس کو اپنے اختیارات کا استعمال بھی کرنا پڑتا تھا۔ شہزادہ سمجھتا تھا کہ مجھ پر بالادستی جتانا چاہتا ہے۔ دراصل شہزادے کے مصاحبین خانخاناں کے خلاف اس کے کان بھرتے رہتے تھے۔ ان میں صادق خاں پیش پیش تھا۔ وہ کہتا تھا خانخاناں احمد نگر کی جنگ اپنے نام لکھنا چاہتا ہے۔

چنانچہ مغلوں کو چاند بی بی سے صلح پر مجبور ہونا پڑا۔ صلح کیا تھی مغلوں کی شکست تھی۔ مغل دربار میں اس صلح کو ناپسندیدگی سے دیکھا گیا۔ ابوالفضل نے لکھا یہ صلح مغلوں کے شایان شان نہیں تھی صلح کی شرطیں یہ تھیں ۔ 1۔ بہادر کو احمد نگر کا سلطان تسلیم کر لیا جائے اور وہ مغل سلطنت کے تحت کام کرے گا۔ 2۔ برار کا صوبہ مغلوں کو دے دیا گیا۔ 3۔ خطبہ اور سکہ مغل بادشاہ کے نام کا ہوگا۔ 4۔ ہاتھی اور ہیرے جواہرات بادشاہ کو خراج کے طور پر بھیجے جائیں گے۔

بظاہر یہ شرطیں مغلوں کے حق میں تھیں مگر مغل مکمل تسلط سے کم پر رضا مند نہیں تھے۔ اس لیے اسے مغلوں کی ہار سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف دکن میں علاقائی عناصر مغلوں کی موجودگی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چاروں طرف پھر سے بغاوتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دونوں جانب شک و شبہ کی فضا قائم تھی۔ ہر دو فریقین معاہدہ کی خلاف ورزی کا ایک دوسرے پر الزام لگاتے تھے۔ برار پر مغلوں کا قبضہ دکنیوں کو کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ چنانچہ دکنیوں نے پھر سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور وہ ایک بار پھر چاند بی بی کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ جب دکنیوں کی صف بندی کی خبر خانخاناں کو ملی وہ اس وقت جالنا میں تھا۔ اسنے بھی اپنی فوجوں کو جمع کیا اور شاہ پور پہنچا۔ جہاں شہزادہ مراد قیام پذیر تھا۔ شاہ پور شہر شہزادہ کا ہی بسایا ہوا تھا اور وہ اکثر وہیں رہتا تھا۔ خانخاناں نے اِس سے جنگ کے لیے کہا مگر شہزادہ نے انکار کر دیا چنانچہ اس بار خانخاناں نے تن تنہا لڑنے کا فیصلہ کیا۔ خانخاناں کا دوست خاندیش کا راجہ علی

خاں ، امبر کا جگناتھ اور دوسرے ہندو راجے اس کے ساتھ تھے۔ اس نے اشتی کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اس مرتبہ دکنیوں کی کمان سہیل خاں کے ہاتھ میں تھی۔

اشتی کی جنگ ایک تاریخی جنگ تھی۔ اس جنگ میں خانخاناں کو اپنی پوری صلاحیتوں کے مظاہرہ کا موقع ملا۔ اس جنگ کا فیصلہ مغلوں کے حق میں ہوا جس کا تمام کریڈٹ خانخاناں کو حاصل ہوا۔ مغلوں کے پاس بیک وقت کبھی ۱۵ ہزار فوج سے زیادہ نہ رہی جبکہ دکنی اتحادیوں کے پاس ساٹھ ہزار فوج تھی۔ اس کے باوجود بھی فتح مغلوں کی رہی۔ ان کے پیچھے ان کی اقبال مندی کا دخل زیادہ تھا۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں مغل ہمیشہ کم فوج سے بڑی فوج پر فتح حاصل کرتے آئے تھے۔ اس جنگ میں توپوں کا استعمال بھی خوب ہوا جو دکنیوں نے پرتگالیوں سے حاصل کی تھیں۔ مغلوں کی بارودی طاقت بھی زیادہ تھی۔ اس جنگ میں خانخاناں کا دوست راجہ علی خاں مارا گیا جو ایک نہایت جری انسان تھا۔ رام چند بھی کام آیا جو ریوا کا راجہ تھا اور رحیم کا دوست تھا۔ وہ پوری رات میدان جنگ میں زخمی پڑا رہا۔ لٹیرے اس کا کان کاٹ کر لے گئے کہ ان میں وہ ہیرے کی بالیاں پہنے تھا۔ راجہ علی خاں کے ہاتھ میں ہراول دستہ کی کمان تھی۔ اور راجہ کو وہاں نہ دیکھ کر اولاً دکنیوں نے خیال کیا کہ خانخاناں مارا گیا اور راجہ علی خاں کے بارے میں مشہور ہوا کہ وہ میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لیکن جنگ کے بعد اس کی لاش عین میدان جنگ میں لاشوں کے نیچے دبی پائی گئی۔ اس کی موت بھی ایک عجیب اتفاق تھی۔ اس کے بارے میں خانخاناں کو ایک جاسوس نے خبر دی تھی۔ کہا جاتا ہے علی بیگ دردی نے جو دشمن کے توپ خانہ کا افسر تھا خانخاناں کو یہ اطلاع دی کہ سہیل خاں کا توپ خانہ بالکل تمہارے سامنے ہے اور وہ کسی وقت بھی فائر کر سکتا ہے۔ چنانچہ خانخاناں وہاں سے ہٹ گیا اور انجانے میں راجہ علی خاں خالی جگہ دیکھ کر وہاں آگیا اور موت کا شکار ہوگیا۔ رات کا وقت تھا وہ صحیح صورت حال کا اندازہ بھی نہیں لگا سکا۔

خانخاناں کی فوج میں دولت خاں لودی جیسے بہادر جنگجو بھی تھے جو موت

سے نہیں ڈرتے تھے۔جنگ کے ایک مرحلہ پر خانخاناں اور دولت خاں دونوں ساتھ تھے اور کل چھ سو گھوڑ سوار ان کی پشت پناہی پر تھے۔ دیکھا کہ دکنیوں کا توپ خانہ آگے بڑھا چلا آتا ہے۔ دولت خاں نے کہا ''اجازت ہو تو قلب پر حملہ کردوں؟'' خانخاناں نے مسکرا کر جواب دیا۔''دلّی کا نام بدنام کرے گا۔'' دولت خاں کا جواب تھا۔ اگر دشمن کے پاؤں اکھاڑ دیے تو سو دلّی بنا لیں گے اور اگر مارے گئے تو معاملہ خدا کے سپرد ہے۔''

اس جنگ میں سادات بارہہ 23 کی ایک جمعیت بھی شریک تھی جس کی کمان قاسم بارہہ کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کے استحکام میں سادات بارہہ کا اہم رول ہے۔ بہت سی جنگوں کی کامیابی کا سہرا ان کے سر ہے۔ دولت خاں لودی نے قاسم بارہہ سے بھی پوچھا کہ کیا رائے ہے۔ آگے بڑھیں کہ پیچھے لوٹ جائیں۔ قاسم نے جواب دیا ''ہم تو ہنودستانی ہیں۔ مرجانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، ہاں البتہ خانخاناں سے پوچھ لو کہ اس کا کیا ارادہ ہے۔'' دولت خاں، خانخاناں کی طرف مڑا اور اس سے مخاطب ہوا۔'اتنا بڑا لشکر سامنے ہے۔ یوں تو فتح و شکست قدرت کے ہاتھ میں ہے۔بظاہر کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے۔ اگر شکست ہوئی تو اپنی جگہ بتا دو جہاں آپ کو ڈھونڈ لیں۔'' خانخاناں کا جواب تھا۔ ''لاشوں کے نیچے۔'' یہاں ہر شخص کشتیاں چلا کر لڑنے آیا تھا۔ یہی انفرادی ہمت و جرأت مغلوں کا طرۂ امتیاز تھی جس نے انہیں جتایا۔

جنگ کے آخری مرحلہ میں دکنیوں کے سپہ سالار سہیل خاں حبشی کو ایک تیر آ کر لگا اور وہ زخمی ہو کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ دکنیوں نے راہ فرار اختیار کی۔ مغلوں نے کامیابی کا ڈنکا پیٹ دیا۔ خانخاناں کو ۱۵۹۶ء میں یہ فتح حاصل ہوئی۔ اسی سال اس کا جواں سال بیٹا حیدر قلی اس دنیا سے رخصت ہوا۔ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اسی سال انبالہ کے مقام پر خانخاناں کی بیوی ماہ بانو کا بھی انتقال ہو گیا۔

خانخاناں اور شہزادہ مراد کے درمیان تعلقات برابر کشیدہ تھے۔ اگرچہ خانخاناں نے دکن کی بیشتر جاگیریں شہزادہ کو دے دی تھیں اور وہ شاہ پور شہزادہ کے پاس بھی جا کر رہا۔ تاکہ اسے اپنا دوست بنا سکے۔ لیکن شہزادہ کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مراد نے بادشاہ کو شکایت کا خط لکھا۔ خانخاناں نے بھی صورت حال سے مطلع کیا۔ اور لکھا کہ وہ واپس آرہا ہے۔ بادشاہ نے ایک سرکاری نوکر روپ سنگھ جو خواص کہلاتا تھا کو خانخاناں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ خانخاناں دکن کی جانب پھر کوچ کرے۔ خانخاناں نے بادشاہ کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا جب تک شہزادہ دکن میں ہے وہ دکن میں نہیں رہے گا۔ اُدھر شہزادہ برابر بادشاہ کو شکایتیں لکھ لکھ کر بھیج رہا تھا۔ آخرکار بادشاہ خانخاناں سے ناراض ہوگیا۔ لیکن بعد میں جب خانخاناں دربار میں حاضر ہوا اور اس نے بادشاہ کے سامنے تمام حقائق رکھے تو بادشاہ کی غلط فہمی دور ہوئی اور خانخاناں کو پھر سے بادشاہ کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔

اُدھر مراد اور اس کی فوج کا برا حال تھا۔ شہزادہ شراب کا عادی تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ فوج میں لاقانونیت پھیلی ہوئی تھی۔ اسے مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ بادشاہ تک جب یہ خبریں پہنچیں تو اس نے ابوالفضل اور سید یوسف مشہدی کو شہزادہ کو واپس لانے کے لیے دکن بھیجا۔ شہزادہ کا یہ حال تھا کہ منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ وہ ابوالفضل یا بادشاہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دکن میں اپنی ناکامی کی شرمندگی تھی شراب نے برا حال کر دیا تھا۔ تلنگانہ میں تمھومی کے مقام پر شہزادہ خیمہ زن تھا اور ابوالفضل بھی وہاں پہنچ گیا مگر افسوس جس روز وہ وہاں پہنچا اسی روز شہزادہ کا انتقال ہوگیا۔ شہزادہ کے کیمپ میں مطلق العنانی پھیلی تھی۔ ابوالفضل نے تین سو سپاہیوں کے دستہ کی مدد سے جو اس کے ہمراہ تھا کسی حد تک نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شہزادہ کا انتقال ۱۲ مئی ۱۵۹۹ء میں ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف تیس سال تھی۔ دکن کی مہم کا پہلا مرحلہ

ختم ہوا ہے۔

## دوسرا مرحلہ

شہزادہ مراد کے انتقال کے بعد اکبر نے اس بار اپنے سب سے چھوٹے بیٹے دانیال کو دکن بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اس کا سپہ سالار عبدالرحیم خانخاناں کو مقرر کیا۔اس مرتبہ زیادہ تیاریاں کی گئیں۔ سابقہ غلطیوں کی روشنی میں نئے اقدامات اٹھائے گئے۔ خانخاناں کی بیٹی جانا (جانان) بیگم سے شہزادہ کی شادی کر دی گئی تاکہ دونوں دو قالب ایک جان ہو کر لڑیں اور سابقہ تلخ تجربہ کو نہ دہرائیں۔

اسی دوران ابوالفضل نے رپورٹ بھیجی کہ خاندیش کا حکمراں بہادر خاں فاروقی جو راجہ علی خاں کا جانشین تھا مغل دربار سے سرتابی کرتا ہے اور اس کی سرکوبی ضرری ہے۔ ابوالفضل نے بادشاہ سے ذاتی طور پر مداخلت کی درخواست کی۔ خاندیش میں قلعہ اسیر ناقابل تسخیر قلعہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ فاروقی نے اس قلعہ میں پناہ لے رکھی تھی۔ بادشاہ نے خانخاناں اور دانیال کو احمد نگر کے لیے روانہ کیا اور خود اسیر گڑھ پر چڑھائی کی۔ خانخاناں نے اس موقع پر دکن کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے بادشاہ کو بہت سے قیمتی تحفے پیش کیے جن میں ایک گھوڑا بھی تھا۔ گھوڑا کیا تھا ایک عجوبہ تھا۔ ہاتھی سے کشتی لڑتا تھا۔ سامنے سے حملہ آور ہوتا تھا۔ پچھلے پاؤں سے حملہ کرتا تھا۔ دو پاؤں پر کھڑا ہو کر اگلے پاؤں ہاتھی کے سر پر رکھ دیتا تھا۔ بادشاہ خاندیش کے دارالخلافہ برہان پور میں خیمہ زن ہو گیا۔ خانخاناں اور دانیال احمد نگر کی جانب بڑھے۔ اس مرتبہ دکنیوں کی کمان ابھنگ خاں کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اپنے کو قلعہ میں محصور کر لیا۔ چاند بی بی اب پہلی سی چاند بی بی نہ تھی۔ وہ مغلوں سے لڑائی کے موڈ میں نہیں تھی۔ ابھنگ نے اس سے مدد کی درخواست کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ دکنیوں نے فوجی مجلس میں مشورہ کیا۔ چاند بی بی سے بھی مشورہ طلب کیا گیا۔ اس نِے لڑنے کے بجائے صلح کرنے کے لیے کہا اس پر لوگ ناراض

ہوگئے۔ خاص طور پر چیتیہ خاں کو اس کا مشورہ بہت ناگوار گزرا۔ اور اس نے فوجوں میں یہ افواہ پھیلا دی کہ چاند بی بی نے مغلوں سے ساز باز کر رکھی ہے۔ اور کہا گیا کہ اس نے باقاعدہ مغلوں کے ساتھ صلح کی مہم چلا دی تھی۔ چنانچہ عقل وفہم کی بات کرنے والوں کا جو انجام ہوتا ہے چاند بی بی کا بھی وہی انجام ہوا۔ اسے قتل کر دیا گیا۔

خانخاناں احمد نگر قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس بار مغلوں کے پاس بھاری توپ خانہ تھا۔ جس کی مدد سے مغلوں نے قلعہ کی ایک دیوار کو منہدم کر دیا۔ قلعہ کے اس حصہ کا نام لیلیٰ تھا۔ اس جنگ میں خانخاناں کے ساتھ ہندو راجاؤں نے بڑی دلچسپی دکھائی جن میں راجہ جگن ناتھ اہم تھا اور جو دکن مہمات میں رحیم کے ساتھ رہا۔ قلعہ کے چاروں طرف سرنگیں بھی بچھائی گئیں۔ ایک شخص یحییٰ خاں دیوار سے چڑھ کر قلعہ کے برج بلبلی یا بابلی میں پہنچا جہاں اس نے دروازہ کھول دیا اور مغل فوج قلعہ کے اندر داخل ہوگئی۔ کئی سو دکنی لڑائی میں مارے گئے۔ آخر کار چار ماہ چار دن کے محاصرہ کے بعد قلعہ فتح ہوگیا۔ بیش بہا خزانہ ہاتھ لگا۔ نظام الدین بہادر شاہ احمد نگر کا سلطان تھا جو نوعمر لڑکا تھا۔ جسے گرفتار کر لیا گیا اور خانخاناں خود اسے لے کر برہان پور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جہاں اُسے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔ بہت سا اسلحہ مغلوں کے قبضہ میں آگیا۔ بیس ہاتھی، قیمتی زیورات اور کپڑے بھی مال غنیمت میں ہاتھ آئے۔ نایاب کتب ومخطوطات کی ایک لائبریری پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔

شہزادہ دانیال بھی برہان پور میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے خاندیش اور برار کا گورنر مقرر کیا گیا۔ ابوالفضل کو اسیر گڑھ دیا گیا۔ مگر ابوالفضل کو خانخاناں کے ماتحت کر دیا گیا۔ افسری و ماتحتی کے تعلق سے جو کبھی دوست تھے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ خانخاناں نے ابوالفضل کے خلاف بادشاہ کو سخت خطوط لکھے۔

احمد نگر اور اسیر گڑھ کی فتح کے بعد بادشاہ آگرہ واپس لوٹ آیا چونکہ شہزادہ سلیم کی سرکشی کی خبریں اسے پریشان کر رہی تھیں۔

اکبر کے دلّی واپس لوٹ جانے کے بعد دکن میں صورت حال بدل گئی۔ اب میاں راجو دکنی اور ملک عنبر دکن میں جنگ آزادی کی قیادت کر رہے تھے۔ میاں راجو ایک مسلمان سید زادہ تھا جبکہ ملک عنبر ایک حبشی تھا۔ اس کا ایک نام بازجیو بھی تھا۔ اصل نام شمبھو تھا۔ دونوں نہایت بہادر اور جنگجو تھے۔ انہوں نے دکن کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ میاں راجو کے پاس دولت آباد اور گجرات کی سرحد تک علاقہ تھا۔ جبکہ گولکنڈہ اور بیجا پور اور احمد نگر تک کا علاقہ ملک عنبر کے قبضہ میں تھا۔ احمد نگر کے تخت پر مرتضیٰ نظام شاہ ثانی بیٹھا تھا اور یہ دونوں مہم جو، اس کے ماتحت تھے آپس میں بھی لڑتے رہتے تھے۔ یہ ایک الگ طویل کہانی ہے۔

بادشاہ نے اس مرتبہ دکن کی مہم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک فوج کا سپہ سالار ابوالفضل کو مقرر کیا تھا جو میاں راجو کے خلاف بھیجا گیا اور احمد نگر جس کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ عبدالرحیم خانخاناں برار اور تلنگانہ میں مقرر ہوا جس کا مقصد ملک عنبر کے خلاف لڑنا تھا۔ اس معرکہ میں خانخاناں کے بیٹے مرزا ایرج نے بھی حصہ لیا اور پانچ ہزار کی فوج کی مدد سے ملک عنبر کو ہرا دیا۔ اس کے ساتھ جنگ میں ملک عنبر سخت زخمی ہوا اور اس کے سپاہی اسے میدان جنگ سے اٹھا کر لے گئے۔ بیس ہاتھی مرزا ایرج کو مال غنیمت میں ملے۔

ملک عنبر کے جب زخم بھر گئے تو اس نے پھر سے جنگ کی تیاری شروع کی مگر اب وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ مغلوں سے ٹکر لینا آسان کام نہیں۔ اس لیے اس نے صلح کرنے میں عافیت سمجھی۔ اس بارے میں اس نے خانخاناں کو تجویز بھیجی۔ خانخاناں نے اس کی تجویز کو منظور کر لیا اور اسکا علاقہ اسے واپس لوٹا دیا۔ اس معاہدہ کے بعد سے وہ دونوں دوست بن گئے اور خانخاناں ایک دوست کی طرح ملک عنبر کی مدد کرتا رہا۔ ملک عنبر سے دوستی کی وجہ سے خانخاناں پر الزام تھا

کہ وہ دکنیوں سے ملا ہوا ہے۔

دکن میں مغلوں کے بڑھتے اثرات کو دیکھ کر دو چھوٹی ریاستیں گولکنڈہ اور بیجا پور بھی خوفزدہ ہوگئیں۔ اور مغلوں سے صلح کرنا چاہتی تھیں۔ بادشاہ کو پیغامات بھیجے گئے کہ شہزادہ دانیال کی شادی جو کہ دکن کا صوبیدار بھی تھا بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ کی بیٹی سے کر دی جائے۔ بادشاہ نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔ دریائے گوداوری کے کنارے ایک قصبہ پیٹھان کے مقام پر بڑی دھوم دھام سے شادی ہوگئی بظاہر اب دکنی سلطانوں سے مغلوں کے تعلقات خوشگوار ہوگئے تھے مگر پھر بھی راجو (سید) جیسی طاقتیں سر ابھارتی تھیں جن کے خلاف مہم آرائی کرنی پڑتی تھی۔ ملک عنبر کے خلاف راجو برابر محاذ آرائی کرتا رہتا تھا۔ ان دونوں کی لڑائی میں خانخاناں نے ملک عنبر کی مدد کی اور وہ خانخاناں کی مدد کی وجہ سے کامیاب ہوتا تھا۔ جالنا کے مقام پر خانخاناں کی چھاؤنی تھی جہاں سے وہ پورے دکن کو کنٹرول کرتا تھا۔ پورا تلنگانہ اور دکن کا بیشتر حصہ خانخاناں کی کوششوں سے مغل سلطنت کے ماتحت آگیا۔

دکن میں دانیال کا بھی وہی انجام ہوا جو مراد کا ہوا تھا۔ دراصل وہ بھی برائے نام ہی صوبیدار تھا۔ سب کچھ تو خانخاناں کو ہی کرنا ہوتا تھا۔ دانیال نے بھی مغل روایت کا پاس رکھا۔ وہ بھی بلا کا شراب نوش تھا۔ بادشاہ کو شہزادہ کی شراب نوشی کی اطلاع پہنچتی رہتی تھی اور جس کی وجہ سے وہ فکر مند رہتا تھا۔ وہ اکثر خانخاناں کو لکھتا کہ شہزادہ کو سمجھائے۔ خاص طور پر لوگوں کو مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ شہزادہ کو شراب نوشی سے روکیں۔ مگر وہ بہانہ بنا کر جنگلوں میں نکل جاتا اور چوری سے شراب پیتا۔ بندوق کی نالیوں، بکرے کی کھال اور پگڑیوں میں چھپا چھپا کر شراب اس کے لیے فراہم کی جاتی۔ آخر ایک دفعہ وہ زیادہ شراب پینے سے ہی بیمار پڑ گیا اور چالیس دن تک بے ہوش رہا اور اسی حالت میں ۲۰ اپریل ۱۶۰۴ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

رحیم کی بیٹی جو شہزادے سے منسوب تھی جوانی میں بیوہ ہوگئی۔ وہ اس غم میں خودکشی کر لینا چاہتی تھی مگر اسے باز رکھا گیا۔ موت کے وقت دانیال کی عمر ۳۳سال اور ٦ ماہ تھی۔ کیسا عبرتناک انجام تھا۔ دانیال کے بچپن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کامیاب رہے گا۔ اسے مضبوط جسم اور تیز دماغ قدرت نے دیا تھا۔ خوبصورت تھا ناک نقشہ دلکش تھا۔ پسندیدہ اطوار کا مالک تھا۔ بہت مجلسی آدمی تھا۔ اچھی گفتگو کرتا تھا۔ ورزش کرتا تھا۔ بہترین نشانہ باز تھا۔ گھوڑے کی سواری میں ماہر تھا۔ ہاتھیوں کا بھی شوق رکھتا تھا۔ برج بھاشا یا ہندی شاعری کا دلدادہ تھا۔ خود بھی ہندی میں شعر کہتا تھا۔ جانا بیگم سے اس کی شادی اسیٔ لیے کی گئی تھی کہ وہ کسی طرح شراب ترک کردے شاید بیوی بھی اس کی عادت چھڑانے میں کامیاب نہ ہوسکی۔

عہد اکبری میں خانخاناں کی زندگی کا باب ختم ہوتا ہے۔ نئی بساط بچھتی ہے۔ اکبر کی موت کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

☆☆
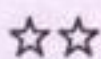
# جہانگیر اور خانخاناں

خانخاناں دولت آباد میں مقیم تھا کہ ۲۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء کی درمیانی شب میں اکبر کی موت کی خبر پہنچی۔ خانخاناں نے سب کام بند کر کے تعزیتی جلسہ بلایا۔ اور سیاہ لباس پہن کر جلسہ میں شریک ہوا۔ تعزیتی تجویز پاس کی گئی اور جہانگیر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ خانخاناں نے اپنے وکیل دولت خاں لودی کو بہت سے قیمتی تحائف جن کی قیمت ڈیڑھ لاکھ تھی اور نئے بادشاہ کے تئیں حلف وفاداری کے ساتھ دربار میں بھیجا۔ دکن میں بنے قیمتی ملبوسات بھی تحائف میں شامل تھے۔ بادشاہ نے خانخاناں کے نام دکن کی صوبیداری کی توثیق کر دی۔ ساتھ ہی ایک جڑاؤ تلوار اور ایک عراقی گھوڑا تحفہ میں بھیجا۔

۱۶۰۷ء میں خانخاناں کو دربار میں طلب کیا گیا کیونکہ تخت نشینی کے بعد سے اس کی حاضری نہیں ہوئی تھی۔ دربار میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ خانخاناں نے بادشاہ کی خدمت میں قیمتی تحائف پیش کیے۔ جہانگیر نے تزک میں خانخاناں سے ملاقات کا حال اس طرح لکھا ہے۔ ''خانخاناں خوشی اور مسرّت سے بے قابو ہو رہا تھا۔ جیسے پاؤں سے نہیں سَر کے بل چل کر آیا تھا۔ نہایت بے خودی کے عالم میں اس نے اپنا سر میرے قدموں میں رکھ دیا۔ نہایت محبت اور پیار کے ساتھ میں نے اسے زمین پر سے اٹھایا اور گلے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس نے تحفہ کے طور پر موتیوں کی دو تسبیحیں کچھ مونگے اور ہیرے جواہرات جن کی قیمت تین لاکھ ہوگی، دوسری مختلف چیزوں کے ساتھ پیش کیے۔ بادشاہ نے خانخاناں کے

مراتب میں اضافہ کیا اور شاہ عباس صفوی والئی ایران کا بھیجا ہوا گھوڑا اور بہت سے ہاتھی انعام میں دیے۔

دکن میں حالات خراب تھے۔ ملک عنبر کو خود کو منظم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے سلطان مرتضٰی دوم کو قید کر لیا اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ جہانگیر مرکز میں اپنے بیٹے خسرو کی سرکشیوں سے پریشان تھا۔ اس لیے دکن پر توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ ملک عنبر گوریلا طریقہ جنگ میں ماہر تھا اور اسے مراٹھوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس لیے اس نے بہت سے مقبوضہ علاقوں کو پھر سے آزاد کرا لیا تھا۔

جہانگیر نے ۱۶۰۸ء میں خانخاناں کو پھر دکن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ خانخاناں نے کہا کہ وہ دو سال میں دکن فتح کر کے دکھا دے گا اگر اسے مزید ۱۲ ہزار فوج اور دس لاکھ روپیہ مل جائے۔ بادشاہ نے یہ شرطیں منظور کر لیں۔ مزید اسے خاندیش اور برار کی صوبیداری بھی دے دی اور آزادنہ کام کرنے کے لیے سیاسی اور مالی اختیارات بھی بڑھا دیے۔ مگر خانخاناں ملک عنبر کے مقابلہ میں دشواریاں محسوس کر رہا تھا۔ ملک عنبر کی فوجی طاقت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اس لیے خانخاناں نے مزید امداد کی درخواست کی۔ بادشاہ نے شہزادہ پرویز اور آصف خاں کو اس کا سرپرست مقرر کر کے دکن کے لیے مزید فوج بھیجی۔ اسی دوران انگریز سیاح ولیم ہاکنس سے خانخاناں کی ملاقات ہوئی۔

۱۶۰۹ء میں سیاح ولیم ہاکنس خانخاناں سے برہان پور کے مقام پر آ کر ملا۔ وہ سورت سے آگرہ ایک شکایت لے کر جا رہا تھا۔ ولیم ہاکنس کی شکایت تھی کہ سورت اور کھمبات میں نئے نئے پرتگالی آ رہے تھے اور مقرب خاں ان سے مل کر ولیم ہاکنس کو قتل کرانا چاہتا تھا۔ کہتے ہیں ولیم ہاکنس نے خانخاناں سے تین گھنٹے تک ملاقات کی اور خانخاناں نے اس کے اعزاز میں

کھانے کا بھی انتظام کیا۔ دونوں میں ترکی زبان میں گفتگو ہوئی۔ رخصت پر خانخاناں نے اسے خلعت سے نوازا اور بادشاہ کے نام سفارشی خط بھی لکھا۔ ہاکنس نے دربار میں قیام کیا۔ ترکی زبان جاننے کی وجہ سے ہاکنس کو بادشاہ اکثر گفتگو کے لیے بلاتا اور پرتگالیوں کے طرز زندگی کے بارے میں سوالات کرتا۔

اس مرتبہ دکن میں خانخاناں کو سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ ملک عنبر اب پہلے والا عنبر نہیں تھا جس کی خانخاناں سے دوستی تھی۔ اس نے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا لی تھی۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ ملک عنبر حبشی تھا مگر اس نے دکن کی وطنیت اختیار کر لی تھی اور احمد نگر کے طاقتور ترین امیر اور فاتح چنگیز خاں سے جنگی تربیت حاصل کی تھی۔ ملک عنبر نے اپنے آقا کی مثالی خدمت انجام دی اور وہ ہمیشہ اس کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی ذہانت اور اخلاقی جرأت نے بہت جلد اسے نظام شاہی حکمرانوں کی مجلس شوریٰ میں پہنچا دیا تھا۔ مغل دربار کے مورخین جو ملک عنبر کی دل کھول کر برائی کرتے ہیں وہ بھی ملک عنبر کی انتظامی صلاحیتوں اور شخصی خوبیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور رہیں۔ ملک عنبر نے اپنا ہیڈ کوارٹر کھڑکی کے مقام کو بنا لیا تھا جسے فتح نگر بھی کہتے ہیں اور جو خود اس کا بنایا ہوا خوبصورت شہر تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور جنگی نقطہ نظر سے محفوظ تھا۔ اس نے نظام شاہی گھرانہ کے ایک لڑکے مرتضیٰ کو سلطان بنا کر خود کاروبار حکومت چلا تا تھا۔

ملک عنبر نے اصلاحات بھی نافذ کیں۔ اس نے دکن میں ٹوڈرمل کا نظام مال گذاری نافذ کیا جس کے سبب کاشت کار خوشحال اور حکومت مالدار ہوگئی تھی۔ اسے دکن پر مکمل تسلط قائم کرنے اور اصلاحات نافذ کرنے کے لیے صرف چھ سال کی مدت ملی تھی۔ اس نے گاؤں پر بھی توجہ دی۔ مالگذاری جنس میں وصول کرنے کا تجربہ کیا۔ پھر نقد لینے لگا۔ عنبر کا سب سے

بڑا کارنامہ اس کی جنگی حکمت عملی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ احمد نگر اپنے محدود وسائل کی وجہ سے مغلوں سے کھلے میدان میں ٹکر نہیں لے سکتا۔ پچھلا تجربہ اس کا ثبوت تھا۔ اس لیے اس نے گوریلا جنگ کا طریقہ اپنایا جس میں اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ پہاڑی علاقہ میں یہ ایک آزمودہ طریقہ تھا۔ اس نے اس کام کے لیے مراٹھا سپاہیوں کو بھرتی کیا جو اس فن کے ماہر تھے اور بحری چوکیاں قائم کیں جن پر عربی النسل حبشیوں کو مقرر کیا۔

چنانچہ جب خانخاناں نے ۱۶۱۰ء میں دوبارہ احمد نگر پر حملہ کیا تو اسے ملک عنبر کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ مغلوں کو گوریلا طریقہ جنگ کا بھی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ برسات کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ قومی مجلس شوریٰ کا مشورہ تھا کہ برسات کے بعد حملہ کیا جائے مگر کچھ افسروں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا اور خانخاناں ناکافی رسد کے ساتھ برہان پور سے احمد نگر کی طرف بڑھا۔ ملک عنبر نے مغل فوجوں کا راستہ روک دیا۔ وہ کھلے میدان میں حملے کر کے پہاڑوں میں غائب ہوجاتا تھا۔ اس طرح وہ مغل فوجوں کو پہاڑوں اور درّوں کے درمیان گھیر لیتا۔ اس نے راستہ میں تمام کھیتوں کو آگ لگا دی اور رسد کے تمام راستے بند کر دیے۔ شاہی فوجوں میں قحط کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ آدمی اور جانور بھوک سے مرنے لگے۔ ادھر بارش شروع ہوگئی اور خانخاناں کو مجبوراً دکنیوں سے صلح کرنا پڑی۔

یہ ایک ذلت آمیز صلح تھی جس کی وجہ سے خانخاناں پر ہر طرف سے الزام تراشی ہونے لگی۔ اس پر جلد بازی اور غلط اقدام کرنے کا الزام لگایا گیا۔ آخر کار خانخاناں کو دربار میں واپس بلا لیا گیا جہاں بادشاہ نے اس کے ساتھ بے رخی اور روکھے پن کا برتاؤ کیا۔ دکن کی مہم کو خان جہاں اور خان اعظم کے سپرد کر دیا گیا۔ خانخاناں کی اس شکست کے بارے میں محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں لکھا ہے۔ ''تکلیف، نقصان، خرابیاں،

ندامتیں سب مینہ کے ساتھ برسیں۔ انجام یہ ہوا کہ جس خانخاناں نے شکست کا داغ نہ کھایا تھا اس نے ۶۳ سال کی عمر میں شکست کھائی۔ فوج برباد اپنے نہایت تباہ و برباد بڑھاپے کے بوجھ اور ذلت کی باربرداری کو گھسیٹ کر برہانپور میں پہنچا۔ وہی احمد نگر جسے گولے مار مار کر فتح گیا تھا۔ قبضہ سے نکل گیا۔''

سب سے اذیت ناک بات یہ تھی کہ مغل امرانے خانخاناں پر کھلم کھلا غداری کا الزام لگایا اور کہا کہ وہ دکنیوں سے ساز باز رکھتا تھا۔ سرٹامس رونے یہ بھی لکھا ہے کہ'' خانخاناں یقیناً دکنیوں سے ساز باز کرتا تھا جن سے اسے پنشن ملتی تھی۔'' لیکن تاریخی کتب سے اس الزام کی تصدیق نہیں ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دکنیوں کے تئیں اس کے دل میں نرم گوشہ رہا ہو مگر اس شکست کو غداری نہیں کہہ سکتے۔ خانخاناں کو جب دربار میں بلایا گیا وہ ایک معتوب اور راندہ درگاہ کی زندگی گزار رہا تھا۔ دکن میں خان اعظم اور خان جہاں کی فوجیں شکست کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

جہانگیر کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اس کی نظر انتخاب پھر خانخاناں پر پڑی۔ خواجہ ابوالحسن نے خاص طور پر مشورہ دیا کہ خانخاناں دکن کے معاملات سے خوب واقف ہے۔ اس کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بادشاہ نے خانخاناں کو کالپی اور قنوج کی جاگیریں دے دی تھیں جہاں وہ گوشہ تنہائی میں زندگی گزار رہا تھا۔ بادشاہ نے یہ مشورہ پسند کیا اور اسے طلب کیا۔ اس کے منصب میں اضافہ کیا۔ بیش قیمت تحفے نذر کیے۔ اس مرتبہ بادشاہ نے خانخاناں کے بیٹوں کو بھی نوازا۔ شاہنواز خاں، داراب اور رحمان داد کو نئے مناصب دیے اور باپ کے ساتھ مہم پر روانہ کیا۔ غرض کہ ۱۶۱۲ء میں خانخاناں ایک بار پھر دکن کی جانب کوچ کرتا ہے۔

اس جنگ میں خانخاناں کے بیٹوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تینوں بیٹوں نے غیر معمولی کارنامے دکھائے۔ خانخاناں کے ساتھ بھی کئی معرکے ہوئے۔ تین سے بھی زائد برسوں تک باپ بیٹے ملک عنبر اوراس کی قیادت میں لڑ رہے دکنیوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ جنگی معرکوں، محاذوں اور میدانوں کی تفصیل پیچ در پیچ ہے۔ جنگ کا نتیجہ مغلوں کی فتح کی صورت میں نمودار ہوا۔ خانخاناں نے میر شہر کے ذریعہ بادشاہ کو جنگ کی تفصیلی رپورٹ بھیجی۔ دربار میں شاندار جشن منایا گیا۔ باشادہ نے شاہنواز کو فرند کا خطاب دیا اور پانچ ہزار کا منصب۔ اسی طرح داراب اور رحمان داد کو بھی انعامات اور عہدوں سے نوازا۔ خانخاناں نے بیش قیمت سامان بادشاہ کو بھیجا۔

اس زمانہ کا ایک قابل ذکر واقعہ انگریز سیاح سر تھامس رو کی خانخاناں سے ملاقات ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ سورت ابھی بھی خانخاناں کی تحویل میں تھا۔ پرتگالی اور دوسری یورپی قومیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں ار ان کے جھگڑے تصفیہ کے لیے خانخاناں کے پاس آتے رہتے تھے۔ اسی طرح کا ایک جھگڑا تھا جسے لے کر سر تھامس رو برہان پور میں خانخاناں سے ملا۔ وہ ۱۴ نومبر ۱۶۱۵ء کو برہان پور آیا تھا اور تین ہفتے وہاں قیام کیا۔ انگریزوں کا جو سامان پرتگالی لے گئے تھے۔ زیادہ تر اس نے انگریزوں کو واپس کرادیا اور خانخاناں نے اسے خلعت بھی دیا۔ برہان پور میں شہزادہ پرویز بھی مقیم تھا جو سرکاری طور پر مہم کا انچارج تھا اور فوجیں اس کی کمان میں تھیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح شہزادہ محض برائے نام کماندار تھا۔ اصل اختیارات خانخاناں کے ہی ہاتھ میں تھے۔

سر تھامس رو نے شہزادہ پرویز سے ملاقات کا ذکر کیا ہے جس سے متذکرہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

’’(برہان پور میں) دربار کے باہر تقریباً سو مسلح سوار تعینات تھے۔ یہ شرفا تھے جو شہزادہ کے باہر نکلنے پر آداب بجا لاتے تھے۔ شہزادہ دربار میں اک بلند شہ نشین پر بیٹھا تھا۔ جو گول تھی اور جس کے اوپر چھتری لگی تھی۔ شہزادہ بڑی شان سے بیٹھا تھا مگر اس کے انداز میں بے ڈھنگا پن تھا۔ سامنے قالین بچھا تھا۔ لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا جب میں قریب پہنچا تو ایک افسر میرے پاس آیا اور مجھے اپنی پیشانی زمین پر رکھنے اور ٹوپی اتارنے کے لیے کہا۔ میں نے کہا میں باعزت مہمان ہوں اور یہاں کے قاعدوں کا پابند نہیں15۔ چنانچہ میں آگے بڑھ گیا اور ایک جنگلے کے قریب شہزادہ کے پاس پہنچ گیا اور آداب بجا لایا۔ شہزادہ نے اپنے جسم کو میری جانب موڑا۔ میں جنگلے کے اندر داخل ہوگیا۔ جہاں عمائدین شہر دست بستہ غلاموں کی طرح کھڑے تھے۔ ایک بیش قیمت شامیانہ اوپر قالین کا فرش نیچے تھا۔ دربار کا نقشہ ٹھیک ایک تھیٹر کی طرح تھا اور شہزادہ تھیٹر کے مصنوعی بادشاہ کی طرح بیٹھا تھا۔ جب میں اندر پہنچ گیا تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میری جگہ کہاں ہے۔ میں شہزادہ کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا جو تین سیڑھی اوپر تھا اور جہاں اس کے سکریٹری کے ذریعہ حکم پہنچایا جاتا تھا۔ لیکن تمام شان و شوکت تو شہزادہ کی ہے لیکن حکومت خانخاناں کی ہے۔‘‘

احمد آباد کے ایک انگریز افسر مسٹر کیرج کے کہنے پر سر تھامس رو

پرویز کے دربار میں گیا تھا جس نے خاص طور پر اپنے خط میں اس کی سفارش کی تھی اور اس نے بھی یہی لکھا تھا کہ شہزادہ ایک نکما و ناکارہ شخص ہے۔ دماغی طور پر کمزور ہے اصل شخص خانخاناں ہے جس کا حکم چلتا ہے جو امرا میں ممتاز ہے اور بہادری میں پورے ملک میں یکتا ہے۔ اس کے بعد خانخاناں کی زندگی کا پرآشوب دور شروع ہوتا ہے۔

☆☆

# شہزادہ خرم اور خانخاناں

1616ء میں جہانگیر نے اپنے بیٹے شہزادہ خرم کو دکن بھیجنے کا فیصلہ کیا جو بعد میں شاہجہاں کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ خود شہزادہ کی بھی فاتح دکن بننے کی خواہش تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ پورے دکن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مغلوں کے جھنڈے تلے لے آئے۔ اسے یہ بھی خیال رہا ہوگا کہ اس کے بھائی اس مہم میں کامیاب نہیں رہے تھے۔ وہ اگر کامیاب ہوگیا تو زیادہ عزت و شہرت کا حقدار ہوگا۔ خانخاناں اور اس کے ساتھی امرا بادشاہ کی اس تجویز کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے کیوں کہ شہزادہ نے بادشاہ کے سامنے یہ بھی شرط پیش کی تھی کہ خانخاناں کو دکن سے واپس بلا لیا جائے اس لیے کہ وہ تن تنہا دکن کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ جب شہزادہ کو معلوم ہوا کہ خانخاناں نے دکن سے آنے سے انکار کر دیا ہے تو شہزادہ نے اپنے ایک امیر عبداللہ خاں کو دکن بھیجا تا کہ وہ خانخاناں سے چارج لے لے۔ لیکن بادشاہ نہیں چاہتا تھا کہ خرم اور حانخاناں کے درمیان ٹکراؤ ہو اس لیے اس نے خانخاناں کو دکن میں رہنے دیا اس طرح عارضی طور پر جھگڑا ٹل گیا۔

مگر نور جہاں اور اس کے ہم نوا و حامی خرم کو دکن بھیجنے پر مصر تھے۔ چنانچہ بادشاہ کو مجبوراً فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ دکن پر مستقل مغلوں کا تسلط قائم ہو جائے۔ شہزادہ پرویز کو دکن سے تبدیل کر کے الہ آباد بھیج دیا

اور اس کی جگہ خرم نے لے لی جسے بادشاہ نے شاہ کا خطاب دیا۔ ویسے تو وہ تھا بھی ولیعہد چونکہ دربار میں بھی بادشاہ کے برابر دائیں جانب بیٹھتا تھا بادشاہ کے حکم کو ماننے کے سوا خانخاناں کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس مرتبہ خود جہانگیر نے مانڈو میں پڑاؤ ڈالا تاکہ وہ میدان جنگ کے قریب رہے۔

شہزادہ نے جب دریائے نربدا پار کیا تو خانخاناں اور دوسرے منصب دار اس کی پیش قدمی کے لیے وہاں پہنچے۔ شہزادہ خرم اپنے بھائیوں کے مقابلہ میں دکن کے معاملات کو سلجھانے میں زیادہ کامیاب رہا۔ اس نے چند ہی ماہ میں دکن کے بہت سے حکمرانوں کو گفت و شنید کے ذریعہ اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیا۔ دکن میں ملک عنبر کا بنایا ہوا وفاق ٹوٹ رہا تھا اور دکنی مسلسل خونریزی سے اکتا گئے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ دوم نے شہزادہ خرم کی آمد کی خبر سنی تو اس نے بھی امن و صلح کے سفیر بھیجے اور دکنی سپہ سالاروں کی طرف سے ۱۵ لاکھ کے تحائف شہزادہ کی خدمت میں پیش کیے۔ بالا گھاٹ کا پورا علاقہ جسے ملک عنبر نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا مغلوں کو واپس لوٹا دیا اور احمد نگر قلعہ کی چابیاں بھی انہیں دے دی گئیں۔

شہزادہ نے جب معاہدہ کی تمام شرطوں کو دکنیوں سے پورا کرا لیا تو وہ ۳۰ رستمبر ۱۶۱۷ء کو تمام فوجوں اور جنگی ساز و سامان کے ساتھ مانڈو میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خانخاناں بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہ اس طرح باپ کے سامنے اپنی طاقت کا بھی مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ بادشاہ شہزادہ کی اس کامرانی سے بہت خوش ہوا اور اسے شاہجہاں کا خطاب دیا جو اس نے بادشاہ بننے کے بعد باقی رکھا۔

اسی سال خانخاناں کے بیٹے شاہنواز کی بیٹی کی شادی خرم سے کر دی گئی۔ خرم کی سفارش پر خانخاناں کو برار، خاندیش اور احمد نگر کا صوبیدار ا

مقرر کر دیا گیا۔ اسی سال خانخاناں کے پوتے امر اللہ نے بارک پور (گونڈوانہ) کی ہیرے کی کانوں پر قبضہ کر لیا جو ایک زمیندار کے قبضہ میں تھیں جس کا نام پوجا تھا اس کان کے ہیرے اپنی خوبصورتی اور چمک میں پورے ہندستان میں مشہور تھے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اسی سال کثرت شراب نوشی سے مرزا ایرج کا بھی انتقال ہوگیا اور اس کے دو سال بعد رحمان داد بھی چل بسا۔

ملک عنبر نے پھر اپنے کو منظم کرنے کی کوشش کی اور بیجا پور اور گولکنڈہ کی ریاستوں سے معاہدہ کر لیا۔ شہزادہ اور خانخاناں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا اور ایک بار پھر اسے مار بھگایا۔ دکنیوں نے کھڑکی کے مقام پر پناہ لی جواب احمد نگر کا نیا دارالخلافہ تھا بعد میں اورنگ زیب نے اسے آباد کیا اور جو اورنگ آباد کے نام سے مشہور ہوا۔

اس مرتبہ دکن کی جنگ سیاسی زیادہ تھی شہزادہ کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ خانخاناں تو دکنیوں کے ساتھ ساز باز رکھتا ہے اور سب کچھ شہزادے نے کیا ہے اور یہ سیاسی پروپیگنڈہ کامیاب بھی رہا جب کہ فوجی صورت حال میں کوئی بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔

## خرم (شاہجہاں) کی بغاوت

اپنے باپ کے خلاف شاہجہاں کی بغاوت خانخاناں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہیں سے خانخاناں کے سیاسی زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ جب اس کی زندگی کی شام تھی وہ مطعون و خوار ہوا۔

دربار میں نورجہاں کا اثر برابر بڑھ رہا تھا۔ اہم کلیدی عہدوں پر اس نے اپنے آدمی مقرر کر دیے تھے۔ ۱۶۲۱ء میں وزیر اعظم اعتماد الدولہ

کا انتقال ہوا تو جہانگیر نے وزارت عظمیٰ بھی نور جہاں کے سپرد کر دی۔ اس تقرر سے نہ صرف یہ کہ شاہجہاں ناراض ہوا بلکہ بہت سے ممتاز امرا کو بھی ناگوار گزرا۔ جہانگیر کے بعد سلطنت مغلیہ کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے گا اس سوال پر امرا و شہزادے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ شہزادہ شہریار بھی تخت کا امیدوار تھا۔ وہ جہانگیر کا بیٹا تھا۔ 17 نور جہاں نے اس کی شادی اپنی بیٹی لاڈلی بیگم سے کر دی تھی جو اس کے پہلے شوہر شیر افگن سے پیدا ہوئی تھی اور وہ اس طرح نور جہاں کا داماد بھی تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بادشاہ بنے۔ جہانگیر اپنی مے نوشی کی وجہ سے انتظامی معاملات سے دستبردار ہوتا جاتا تھا اور زیادہ تر نور جہاں کے فیصلوں پر عمل کرتا تھا۔ صرف خطبہ میں نور جہاں کا نام نہ تھا باقی اسی کا حکم چلتا تھا۔ جہانگیر برائے نام بادشاہ تھا۔ نورجہاں کے دربار پر پوار تسلط قائم کرنے سے شاہجہاں اور خانخاناں دونوں ناراض ہو گئے۔

1621ء میں ایران کے بادشاہ شاہ عباس صفوی نے قندھار پر حملہ کر دیا۔ یہ آخری مغل علاقہ تھا جو مغلوں کے پاس رہ گیا تھا۔ جہانگیر نے شاہجہاں اور خانخاناں کو دکن سے واپس طلب کر لیا اور انہیں قندھار کی مہم پر بھیجنے کا حکم دیا۔ نورجہاں کا ایک مقصد تھا کہ شاہجہاں باپ سے دور رہے اور وہ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر شہریار کے لیے راستہ صاف کر دے۔ وہ ابھی قندھار پر حملہ کی تیاری کر رہے تھے کہ دھولپور کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دھولپور کو شہریار اور خرم دونوں اپنی جاگیر مانتے تھے۔ شاہجہاں نے بادشاہ کو باخبر بھی کیا تا کہ اگر دھولپور شہریار کو دے دیا گیا تو اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ نورجہاں کے کہنے سننے پر بادشاہ نے دھولپور کی جاگیر شہریار کے نام لکھ دی۔

شاہجہاں نے دھولپور پر حملہ کر دیا اور نہ صرف دھولپور بلکہ

دوسرے خالصہ علاقوں کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ بادشاہ شاہجہاں کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوا اور اس نے غصہ میں قندھار کی مہم بھی اس کے نام سے منسوخ کر کے شہریار کو دے دی۔ شاہجہاں کو بڑا دُکھ ہوا۔ اسنے بادشاہ کے پاس کئی عرضداشتیں بھی بھیجیں مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شاہجہاں حقیقت میں صلح چاہتا تھا۔ اس نے بادشاہ سے ملاقات کا وقت مانگا جو نہیں دیا گیا۔ نور جہاں، بیٹے کو باپ سے ملنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ شاہجہاں نے قاضی عبدالعزیز کو اپنا ایلچی بنا کر بھیجا۔ مگر اس کی بات سننے کے بجائے اسے بھی گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ مجبوراً شاہجہاں کو علم بغاوت بلند کرنا پڑا۔ اس بغاوت میں خانخاناں نے شاہجہاں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا داراب خاں بھی تھا۔ یہ فیصلہ اس کے زوال کا سبب بنا۔

جہانگیر کو خانخاناں کے اس طرز عمل سے بہت تکلیف پہنچی۔ وہ تزک میں لکھتا ہے۔ ''جب خانخاناں جیسے امیر نے جو میری اتالیقی کے منصب پر فائز تھا۔ ستر برس کی عمر میں کافرنعمتی (غدّاری) سے منہ کالا کیا تو اوروں سے کیا گلہ۔ گویا اس کی سرشت میں بغاوت اور کافرنعمتی تھی۔ اس کے باپ (بیرم خاں) نے اخیر عمر میں میرے پدر بزرگوار (اکبر) کے ساتھ یہی شیوہ ناپسندیدہ کیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی پیروی کی اور اس عمر میں اپنے تئیں مطعون اور مردودِ اَزل واَبد کیا۔''

معلوم نہیں کیا حالات تھے کہ خانخاناں اپنے فیصلہ پر قائم نہ رہ سکا۔ شاہجہاں کا ساتھ چھوڑ کر جہانگیر سے جا ملا۔ وہ بے یقینی کا شکار ہو گیا۔ شاید اسے غلطی کا احساس ہوا ہو کہ اس نے بادشاہ کے مقابلہ میں شہزادہ کا ساتھ دے کر غلطی کی تھی۔ یا شاید وہ دونوں میں صلح کرانا چاہتا تھا۔ یا اسے شاید یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ شہزادہ یہ جنگ جیت نہیں سکے گا۔ خانخاناں کو اپنا

اور اپنے بچوں کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا یا انتہا درجہ کی چالاکی تھی کہ وہ دونوں سے سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو پیغامات بھیجنے شروع کیے کہ وہ تو شاہجہاں کے ساتھ بہ مجبوری ہے اور اس کے لیے موقع نہیں کہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو۔ ایسا ہی خط جو اس نے بادشاہ کی تعریف میں مہابت خاں کو لکھا تھا شاہجہاں کے آدمیوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔ خط کے نیچے ایک شعر 18 بھی لکھا تھا جس کا مطلب تھا کہ مجھ پر سیکڑوں لوگوں کی نگاہیں ہیں ورنہ تو میں اس مصیبت سے کبھی کا نکل کھڑا ہوتا کیوں کہ امرا ایک ایک کر کے شہزادے کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ یہ کھلی ہوئی غداری تھی۔ شاہجہاں نے باز پرس کی مگر خانخاناں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ شاہجہاں نے خانخاناں اور اس کے بیٹوں کو حراست میں لے لیا۔ ان پر کڑی نظر رکھی جانے لگی داراب خاں بھی شاہجہاں کی حمایت سے دستبردار ہو گیا تھا۔

خانخاناں کو اپنے بیٹوں سے بہت محبت تھی۔ پدرانہ شفقت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی تھی۔ وہ اپنے کو کمزور محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی سب سے بری تشویش تھی کہ کسی طرح اس کے بیٹوں کی جان بچ جائے۔ ماثر الامرا میں لکھا ہے کہ جس وقت شہزادہ پرویز اور مہابت خاں، شاہجہاں کا پیچھا کر رہے تھے اور اسے دکن سے باہر بھگانا چاہتے تھے تو خانخاناں نے راجہ بھیم کو خانخاناں کے بیٹے جس کی قید میں تھے ایک درد بھرا خط لکھا تھا جس میں وہ لکھتا ہے ''اگر شہزادہ (شاہجہاں) اس کے لڑکوں کو رہا کر دے تو وہ شاہی فوجوں کا رخ موڑ دے گا اور اگر اس کی بات نہ مانی تو شاہجہاں کو زیادہ سنگین حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔'' 19 یہ ایک طرح کی دھمکی بھی تھی۔ راجہ بھیم نے بھی سخت جواب دیا کہ ابھی شاہی فوجیں کافی طاقتور ہیں اگر اس نے کوئی حرکت کی تو نہ صرف یہ کہ اسے بلکہ

اس کے بیٹوں کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔ خانخاناں یہ جواب پا کر خاموش ہوگیا۔

شاہجہاں کو ہر طرف سے ناکامی کا سامنا تھا۔ وہ خانخاناں اور اس کے بیٹوں پر بھروسہ کرتا تھا مگر وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ مہابت خاں کی چالاکی نے شاہجہاں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ ایک خط خانخاناں کو لکھا جس میں لکھا کہ۔'' شہزادہ بھی بادشاہ کے ساتھ صلح کرنے پر آمادہ ہے۔ اب وقت آگیا ہے جب باغی اور سازشی اپنے کیفرکردار کو پہنچیں گے۔ اس نے مزید لکھا کہ سلطنت کی حفاظت اور امن و امان ہم دونوں کا واحد مقصد ہے۔ آپ شہزادہ کو سمجھائیں اور ایک دو اشخاص کو ثالث کے طور پر بادشاہ کی خدمت میں بھیجنے کا بندوبست کریں تاکہ مزید خون خرابہ نہ ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ بادشاہ شہزادہ کو مزید جاگیریں اور اعزازات عطا کریں گے۔ شہزادہ مزاحمت کی پالیسی چھوڑ دے گا۔'' وغیرہ۔ یہ خط مہابت خاں نے اس طرح بھیجا کہ شاہجہاں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ ایسا ہی ہوا بھی، اور یہی مہابت خاں کا مقصد بھی تھا۔ وہ ایک طرف یہ چاہتا تھا کہ خانخاناں اور شہزادہ کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع ہوجائے اور دوسری طرف وہ شہزادہ پر نفسیاتی اثر ڈالنا چاہتا تھا تاکہ اس کا حوصلہ پست ہو جائے اور وہ ہتھیار ڈال دے۔ اس مقصد میں مہابت خاں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

اب خانخاناں کا وقار بادشاہ کی نظروں میں گر چکا تھا۔ وہ ایک طرح سے نظربند کر دیا گیا جہاں اس کا خیمہ لگایا جاتا، شہزادہ پرویز کا خیمہ اس کے برابر لگایا جاتا تاکہ خانخاناں کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جاسکے۔ اس کی بیوہ بیٹی جانا بیگم بھی قید میں اس کے ساتھ تھی۔ شاہجہاں کی اس بغاوت میں خانخاناں کا وفادار غلام اور بہادر جنگجو ساتھی میاں فہیم بھی قتل

ہو گیا۔

جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ جب خانخاناں کو ثالث بنا کر بادشاہ کے پاس بھیجا جا رہا تھا تو شاہجہاں نے اس سے گڑگڑوا کر کہا تھا۔'' مجھ پر کٹھن وقت آن پڑا ہے۔ میری حالت نازک ہے۔ میں خود کو تمہارے حوالے کرتا ہوں اور اپنی عزت و آبرو کا محافظ بناتا ہوں۔ تم بادشاہ کے سامنے میری اس طرح وکالت کرنا کہ میرے لیے جو نفرت اور غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے وہ ختم ہو جائے۔'' شاہجہاں نے قرآن اس کے ہاتھ میں دے کر حلف وفاداری لیا۔ اس پر بھی اطمینان نہ ہوا تو خانخاناں کو حرم میں لے گیا جہاں بیگمات کے سامنے اس سے قسمیں وعدے لیے۔ مگر افسوس کہ خانخاناں نے کسی بات کی بھی پرواہ نہ کی اور اسنے شاہی کیمپ میں پہنچ کر شاہجہاں کو بالکل فراموش کر دیا۔ ممکن ہے اگر خانخاناں اپنا یہ مشن ایمانداری سے پورا کرتا تو بادشاہ اور شہزادہ دونوں کی نظروں میں سرخرو ہو جاتا مگر شاہجہاں سے بے وفائی کر کے خانخاناں نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

شاہجہاں کے حکم سے داراب کے بیٹے اور بھتیجے کو قتل کر دیا گیا۔ ادھر جہانگیر کی فوجوں نے داراب کو بھی گرفتار کر لیا۔ وہ شکست خوردہ سلطان پرویز کے سامنے پیش ہوا۔ مہابت خاں نے بادشاہ سے داراب خاں کے قتل کا حکم حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ مہابت خاں نے حکم دیا کہ داراب کا سر کاٹ کر خانخاناں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس کا سر کاٹ کر دسترخوان میں کھانے کی طرح سجا کر باپ کے سامنے لایا گیا۔ سپاہیوں نے کہا ''مہابت خاں نے تربوز بھیجا ہے۔'' خانخاناں سمجھ گیا اور آبدیدہ ہو کر بولا ''تربوز تو ہے لیکن شہیدی ہے۔'' (یعنی شہید کا سر ہے)

خانخاناں کو دربار میں طلب کر لیا گیا۔ مہابت خاں نے بڑی

عزت کے ساتھ اسے روانہ کیا۔ مآثرالامرا میں لکھا ہے ''بیسویں سال جلوس جہانگیری میں جہانگیر بادشاہ نے اس کو (خانخاناں) مہابت خاں کے پاس سے حضور میں طلب کر کے اس کے جرموں کو معاف کر دیا اور خود معذرت کی کہ یہ سب باتیں ہماری تقدیر میں لکھی تھیں۔ ہمارے تمہارے اختیار میں نہ تھیں۔ میں خود تم سے زیادہ شرمندہ ہوں۔ اور اک لاکھ روپیہ انعام دیا کہ اپنی حالت سدھار لو۔ منصب بحال کیا۔ خانخاناں کا خطاب جو چھن گیا تھا اور مہابت خاں کو دے دیا گیا تھا واپس خانخاناں کو مل گیا۔ قنوج کی جاگیر مرحمت ہوئی۔ خانخاناں نے اس موقعہ پر جہانگیر کے عنایت و کرم پر یہ شعر لکھا اور جسے انگوٹھی میں کندہ کرایا۔

مرا لطف جہانگیری زتائیدات یزدانی
دوبارہ زندگی دادہ، دوبارہ خانخانانی

خانخاناں اپنی جاگیر قنوج کے لیے روانہ ہوا مگر اس کا ستارہ گردش میں تھا۔ مہابت خاں نے اسے وہاں جانے سے روک دیا اور واپس دربار میں بھیج دیا۔ خانخاناں بادشاہ سے اجازت لے کر لاہور چلا گیا جہاں شاید وہ مستقل قیام کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۷۳ سال تھی۔

اسی دوران دربار میں ایک اور تبدیلی واقع ہوئی۔ نورجہاں اور اس کے ساتھی امرا کا اثر ختم ہوگیا۔ اصل طاقت مہابت خاں کے ہاتھ میں تھی۔ نورجہاں پارٹی کو اس نے ایک طرح سے قیدی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نورجہاں مہابت خاں کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ مصیبت کی اس گھڑی میں بوڑھے خانخاناں کی یاد آئی۔ اس نے پیش کش کی کہ وہ مہابت خاں کے خلاف جنگ کرے۔ بارہ لاکھ روپے۔ اجمیر کی صوبہ داری۔ ہیرے جواہرات۔ ہاتھی گھوڑے اس مہم کیے لیے خانخاناں کو پیش کیے۔ سات ہزاری منصب دیا۔ خانخاناں کی صحت اب اس قابل نہ تھی کہ

وہ اتنی بڑی مہم کا بوجھ اٹھا سکتا۔ تاہم وہ لاہور سے دلّی کے لیے روانہ ہوا اور ابھی دلّی پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ راستہ میں انتقال ہوگیا۔ مآثرالامرا میں اس کی موت کا سال ۱۰۳۶ھ دیا ہے جو ۱۶۲۷ء ہوتا ہے۔ اس سال کے وسط میں اس کا انتقال ہوا۔ محمد حسین آزاد نے بھی موت کا یہی سال لکھا ہے۔ خانخاناں کی موت کے ساتھ ایک ہنگامہ خیز اور عہد ساز زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کی موت کے چند ماہ بعد جہانگیر بھی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ جہانگیر کی موت ۱۹ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو ہوئی۔ اس نے ۵۸ سال عمر پائی اور ۲۲ سال حکومت کی۔ خانخاناں کو دلّی میں اس کی بیوی کی قبر کے قریب دفنایا گیا جہاں اس کا مزار آج بھی موجود ہے اور جسے خود خانخاناں نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرادیا تھا۔

☆☆
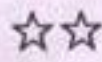
# سیرت و شخصیت

عبدالرحیم خانخاناں کی رگوں میں دو عظیم الشان خاندانوں، ترکوں اور منگولوں کا خون دوڑ رہا تھا اور وہ ایرانی تہذیب و تمدن کی فضا میں پروان چڑھا تھا۔ اس کی ماں ہندی نژاد ایک میواتن خاتون تھی۔ اس زمانہ میں ترک، منگول، ایرانی اور ہندستانی۔ یہی چار طاقتیں تھیں جن کی شجاعت و بہادری، تہذیب و تمدن اور علم و ہنر کے چاروں طرف چرچے تھے۔ خانخاناں کی شخصیت میں یہی چار عناصر باہم شیر و شکر ہو گئے تھے۔ ترکوں اور منگولوں سے اسے شجاعت و حریت فکر ملی تھی، ایرانی تہذیب نے اسے اخلاق و آداب سکھائے تھے اور علم و ہنر سے آراستہ کیا تھا۔ ہندوستانی ماں کی گود میں اس نے عرفان و بھگتی، رواداری اور محبت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خانخاناں ان چاروں تہذیبوں کی اعلیٰ ترین قدروں کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کی ہمہ جہتی اور رنگا رنگی کی وجہ بھی یہی تھی۔ اس عہد کی پوری دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو عبدالرحیم خانخاناں کے ہم پلّہ کوئی دوسری شخصیت دکھائی نہیں دیتی۔ خاص طور پر تمام مسلم ممالک میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس کا تقابل خانخاناں سے کیا جا سکے۔

بیرم خاں شیعی عقائد رکھتا تھا مگر خانخاناں اپنے کو سنّی کہتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ شیعہ ہے اور تقیہ کر کے اپنے اصل عقائد کو چھپاتا ہے۔ اس پر یہ بھی الزام تھا کہ وہ دکنی حکمرانوں سے ساز باز رکھتا تھا۔ کیوں کہ وہ شیعہ تھے۔ مگر ہم عصر شواہد سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھا۔ شیخ احمد سرہندی اور شیخ

عبدالحق محدث کی تحریروں سے بھی اس کا سُنّی ہونا ثابت ہے۔ اس کے بیٹے اعلانیہ سُنّی الجماعت تھے۔ اس کی ماں سنّی تھی۔ شیعوں کو مراعات و عہدے دینے کا بھی اس پر الزام نہیں تھا جو شیعوں پر عام طور پر لگادیا جاتا ہے۔ وہ اسی حد تک مذہبی انسان تھا کہ ارکان اسلام کی پابندی کرتا تھا۔ اس نے اکبر کا دین الہیٰ بھی قبول نہیں کیا تھا اگرچہ بادشاہ اسے اپنا مرید کہتا تھا۔ خانخاناں کا مسلک انسانیت تھا وہ صوفیا کے مسلک کا پیروکار تھا اور عقیدہ کی بنا پر کسی سے امتیاز نہیں برتتا تھا۔ اس کے رفیق و دوست اور ساتھ کام کرنے والوں میں ہندو بھی تھے۔ شیعہ بھی اور سنی بھی۔ اس کا فیض سبھی کو پہنچتا تھا۔ لیکن بلاشبہ اس کی فکر میں شیعی اثرات کی کارفرمائی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

خانخاناں خوبصورت اور وجیہہ انسان تھا۔ مصور، اس کی تصویریں بنا کر بیچتے تھے جو لوگ گھروں اور دکانوں میں سجاوٹ کے طور پر لگاتے تھے۔ عورتیں اسے دیکھ کر اس پر عاشق ہوجاتی تھیں۔ وہ مجلسی انسان تھا۔ گفتگو کے آداب سے واقف تھا۔ جب بات کرتا لوگ ہمہ تن گوش ہوجاتے۔ شیریں کلامی، بزلہ سنجی اور لطیفہ گوئی سے وہ محفل پر چھا جاتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اعلیٰ خاندان کی ایک حسین و جمیل عورت خانخاناں پر عاشق ہوگئی۔ اس نے خادمہ کو مقرر کیا کہ کسی طرح خانخاناں کو اس کے پاس لے آئے۔ یہ بھی کہلوایا کہ وہ خانخاناں جیسے خوبرو بیٹے کی ماں بننا چاہتی ہے۔ اس عورت نے اپنی تصویر بھی خانخاناں کے پاس بھجوائی۔ خانخاناں نے خادمہ کے ذریعہ جواب بھجوایا بی بی! یہ کام تو مشکل نہ تھا۔ میں تمہاری خواہش کو ضرور پورا کرتا لیکن خدا معلوم اولاد ہو نہ ہو اور اگر ہو بھی تو ضروری نہیں کہ لڑکا ہی پیدا ہو اور وہ زندہ بھی رہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ میری شکل وصورت کا نہ ہو۔ اس لیے میں یہی عرض کروں گا کہ مجھے اپنا بیٹا سمجھو اور خدا کا شکر ادا کرو کہ ایک پلا پلایا بیٹا تمہیں دیا۔ میں اپنی ماں کو جس قدر روپیہ دیتا ہوں۔ اتنا ہی تمہیں بھی بھیجتا رہوں گا۔

اس واقعہ سے خانخاناں کی سیرت اور ذہانت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ عورتوں کا دلدادہ نہیں تھا۔ دوسرا جواب بڑا پر لطف ہے جو ایک ذہین انسان ہی دے سکتا ہے۔اس کی پاک بازی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے حرم میں ماہ بانو کے علاوہ ایک دو لونڈیاں ہی تھیں۔ اس کی زیادہ تر اولاد ماہ بانو سے ہی پیدا ہوئیں۔ شراب سے بھی اسے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ جبکہ شراب نوشی اور عیاشی مغلوں میں عام تھی۔ محمد حسین آزاد نے خانخاناں کی شراب نوشی کے بارے میں لکھا ہے:

''اگر دربار کی پارٹیوں میں گھر جاتے تو شراب بھی پی لیتے تھے۔ ایک مرتبہ خاندیش سے دربار میں بلایا گیا۔ وہاں شب عاشورہ کو محفل میں امرا جمع ہوئے۔ اس کے بیان میں ملاّ صاحب (بدایونی) کیا مزے سے چٹکی لیتے ہیں، اسی مجلس میں ساقی نے جام بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے خانخاناں کو پیش کیا، ملاّ صاحب جو چاہیں فرمائیں مگر یہ تو کہیں زمانہ کیا تھا۔ جن صحبتوں میں صدر شریعت اور مفتی اسلام خود مانگ کر جام لے۔ وہاں خانخاناں بادشاہ کا دیا ہوا جام نہ پی جائے تو کیا کرے۔ یہ بیچارہ ایک ترک بچہ سپاہی زادہ تھا۔''

اس واقعہ سے بھی خانخاناں کی پارسائی ہی ظاہر ہوتی ہے۔ ہم عصر کسی بھی تاریخ میں اس کی عیاشی یا شراب نوشی کا ذکر نہیں ہے۔ اس عہد میں ان دونوں برائیوں سے پرہیز خانخاناں کی سیرت کی پاکیزگی اور اس کے کردار کی بلندی کو ظاہر کرتا ہے۔

بعض تاریخوں میں خانخاناں کو کینہ ور، زمانہ ساز اور دنیا پرست کہا ہے۔ شیخ احمد سرہندی اسے جاہ پرست اور انا پرست بتاتے ہیں۔ خود اس نے اپنے خطوں

میں لکھا ہے کہ دشمن کو دوست بنا کر مارنا چاہئے اور نیز چالوں کے بغیر کوئی شخص کامیاب نہیں ہوسکتا۔ مگر چالوں کو ہتھیلد کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ اس کی غیر معمولی سخاوت اور دریا دلی کے بارے میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ دکھاوا کرتا ہے۔ جاہ پرست ہے، نام ونمود کی خواہش ہے۔ خانخاناں بنیادی طور پر ایک فوجی اور سیاسی شخص تھا۔ دربار کی ریشہ دوانیوں اور باہمی کشمکش کے ماحول میں جہاں ہر شخص ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی اندھی دوڑ میں مصروف تھا۔ اپنے وجود کی بقا کے لیے اتنی ہوشیاری اور چالاکی تو ضروری تھی۔ خانخاناں میں ڈپلومیسی کی یہ خوبی اگر نہ ہوتی تو وہ اتنے بلند مقام تک نہ پہنچ پاتا۔

خانخاناں کو شاہی عدالتوں اور درباروں کی خبروں کی جانکاری رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اسنے بازار ومحلوں میں اپنے لوگ چھوڑ رکھے تھے جو دن بھر کی خبریں اس تک پہنچاتے تھے۔اہم مقامات پر چوکیاں قائم کر رکھی تھیں جہاں سے خبریں اس تک پہنچتی رہتی تھیں۔ رات کی تنہائی میں خانخاناں ان سب خبروں کا مطالعہ کرتا اور مطالعہ کے بعد کاغذوں کو جلا دیتا تھا۔

خانخاناں کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ اپنا ذاتی کام یا شاہی کام نکالنے کے لیے اپنے مرتبہ کا بھی خیال نہ کرتا تھا۔ دشمنوں سے بھی بگاڑتا نہیں تھا۔ نہ جانے کب کوئی کام آجائے۔

داد و دہش اس زمانے کا عام فیشن تھا۔ یہ خوبی محض خانخاناں کی ذات کے ساتھ منسوب نہ تھی۔ امرا وشہزادے فلاحی کاموں میں بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ بلاشبہ اس سے انہیں شہرت ملتی تھی جو وہ چاہتے تھے بلکہ ایسے کاموں کی خاص طور پر تشہیر کی جاتی تھی کہ عوام کے دلوں میں ان کی عزت بڑھے۔ اہل ہنر اور اہل کمال کی سرپرستی بھی اسی زمرہ میں آتی تھی۔ ایک طرح سے یہ نشریات کے ادارے تھے جن سے بادشاہ، امرا اور شہزادے اپنے شخصی امیج کو عوام کے ذہنوں پر نقش کرتے تھے خانخاناں بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ تاہم اس میدان

میں وہ دوسرے لوگوں سے بازی لیے ہوئے تھا۔ بادشاہ کی طرح خود اس کا دربار تھا جس میں اہل علم و ہنر باقاعدہ ملازم تھے۔ خانخاناں میدان جنگ یا سیاسی زندگی میں دوست دشمن کی تمیز نہیں کرتا تھا۔ جیسا موقع ہوتا ویسا ہی کرتا۔ ابتدائی ایام میں ابوالفضل اور وہ دنوں دوست تھے۔ گجرات اور سندھ کی مہمات کے دوران دونوں میں دوستانہ خط و کتابت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے غمگسار اور دمساز معلوم ہوتے ہیں۔ گھریلو زندگی کے دکھ سکھ کے شریک ہیں۔ لیکن دکن کی مہم کے دوارن جب بادشاہ ابوالفضل کو بھی فوج کی کمان دے کر دکن بھیجتا ہے۔ خانخاناں کے ساتھ اس کے تعلق کشیدہ ہوجاتے ہیں۔ یہاں خانخاناں اپنے دیرینہ دوست کو طرح طرح سے ذہنی اذیتیں پہنچاتا ہے۔ ابوالفضل اپنے خطوں میں بادشاہ سے آہ و زاری کرتا ہے اور خانخاناں کی شکایت کرتا ہے۔ خانخاناں کی شخصیت کا یہ الگ ہی روپ ہے۔

شجاعت ایک سپاہی کا زیور ہوتی ہے۔ رحیم اس زیور سے آراستہ تھا۔ وہ ایک کامیاب فوجی حکمت عملی تیار کرنے میں ماہر تھا۔ ہم اسے آج کے زمانہ کا بہترین اسٹڈ بجسٹ کہہ سکتے ہیں۔ اکثر اس نے بہت کم فوجوں کے ساتھ حریف کی کئی گنا فوجوں کے قدم اکھاڑ دیے۔ سرنبج کے مقام پر تو وہ بڑی بے سروسامانی کے عالم میں لڑا اور کامیاب رہا۔ وہ جنگوں کے نقشے بنانے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ بعض مرتبہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محض اس کی ذاتی صفات کی وجہ سے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ دشمن کی فوجوں کو دھوکے میں رکھنا۔ ان کے رازوں سے واقف ہونا صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنا اور پھر زندگی یا موت کا نعرہ لگاتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑنا۔ یہ خانخاناں کا طرۂ امتیاز تھا۔ شاید خانخاناں کی انہی خوبیوں کی وجہ سے ایران کا بادشاہ شاہ عباس اکثر کہا کرتا تھا:

> ”کاش خانخاناں جیسا سپہ سالار میرے پاس ہوتا تو میں تمام کاروبار سلطنت اس پر چھوڑ کر خود عیش و شہرت میں زندگی گزارتا۔“

خانخاناں سے جو بڑی سیاسی غلطی ہوئی وہ اس کی سیرت کی کمزوری کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ جہانگیر اور اس کے بیٹے شاہجہاں کے درمیان جنگ میں خانخاناں نے بیٹے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ خانخاناں اور اس کے بیٹے کچھ عرصہ اپنے اس فیصلہ پر قائم رہے اور جب دیکھا کہ باپ کے مقابلہ میں بیٹا کامیاب نہیں ہوسکتا تو وہ باپ سے جاملے۔ باوجودیکہ شاہجہاں قرآن ہاتھ میں دے کر حلف لیتا ہے اس کے سامنے آہ و زاری کرتا ہے۔ روتا ہے، گڑگڑاتا ہے مگر خانخاناں اس کے باوجود شاہ سے مل جاتا ہے اور بیٹے کے خلاف سازشوں میں شریک ہوجاتا ہے۔خانخاناں کے پاس اس طرزِعمل کی حمایت میں کوئی جواز نہیں۔ اسے شاہجہاں کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیئے تھا۔ وہ اپنے کو قسمت کے حوالے کر دیتا اور قدرت کے فیصلے کا انتظار کرتا۔ محض اپنے بیٹوں اور خود اپنی زندگی بچانے کے لیے اس نے یہ اقدام کیا جس سے اس کا وقار بری طرح مجروح ہوا اور وہ دوست و دشمن دونوں کی نظروں میں گر گیا۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ نہ اپنی عزت بچاسکا اور نہ اپنے بیٹے کی زندگی۔ مگر اس واقعہ سے خانخاناں کی عظمت میں فرق نہیں آتا ہے۔ اس کے دوسرے کارنامے تاریخ کے اوراق میں چاند ستاروں کی طرح چمکتے رہیں گے۔

خانخاناں کی سخاوت اور فیاضی کے واقعات ضرب الامثال کی طرح مشہور ہیں جو اس کی سیرت کا درخشندہ و تابناک رخ پیش کرتے ہیں۔ چند قصے یہاں بیان کیے جاتے ہیں۔

☆ اصفہان کا رہنے والا ایک شاعر ملا شکیبی سندھ کے مقام پر خانخاناں سے آکر ملاقات کرتا ہے۔ ساقی نامہ لکھ کر خانخاناں کی خدمت میں پیش کیا۔ خانخاناں نے اسے تین ہزار روپے ایک خلعت اور ایک عراقی گھوڑا انعام میں دیا۔ شکیبی حج کے لیے جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے زادِ راہ کے لیے اسی ہزار روپے دیتا ہے۔ راستہ میں اس کا مال و اسباب لُٹ جاتا ہے تو خانخاناں مزید روپیہ مدد کے لیے بھیج دیتا ہے۔ ملا شکیبی جب حج سے واپس آیا تو اس نے عجیب و غریب واقعہ خانخاناں

کو سنایا۔ اس نے بتایا کہ جب عدنان کی بندرگاہ پہنچا تو وہاں کچھ لڑکے عربی میں گیت گا رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ اب خانخاناں آگیا ہے تو لڑکیوں کو شوہر مل جائیں گے۔ بازار میں چیزوں کے دام بڑھ جائیں گے۔ باغوں میں پھل آئیں گے۔ پانی سے تالاب بھر جائیں گے۔ لوگوں کی پریشانیاں دور ہوں گی ۔ ملا شکیبی کہتے ہیں کہ یہ گیت سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔(اپنے محسن کی تعریف بیان کرنے کا یہ علامتی پیرایہ بیان ہے)

☆ شاعر ملا شوقی خانخاناں کے دربار سے وابستہ تھا۔ ایک دن اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں نے کبھی خزانہ (ٹریجزری) نہیں دیکھا۔ خانخاناں نے حکم دیا اسے خزانہ دکھاؤ۔ خزانہ میں لے جا کر اس سے کہا گیا کہ لے جاؤ جس قدر لے جاسکتے ہو۔ ململ کا کرتہ پہنے تھا۔ جس میں زیادہ روپے نہیں آسکتے تھے۔ خانخاناں نے اسے ایک چادر دی اور کہا اس میں بھرلو۔

☆ نظیری نیشاپوری ایک مشہور شاعر تھا اور خانخاناں کے دربار میں ملازم تھا۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں وہ ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ ہندوستانی تنقید نگاروں نے اس کی شاعری پر بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ وہ نیشاپور سے چل کر آگرہ پہنچا جہاں خانخاناں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ان ہی دنوں خانخاناں فتح گجرات سے آگرہ لوٹا تھا۔ وہ آگرہ سے احمد آباد چلا گیا جہاں اس نے مستقل سکونت اختیار کرلی۔ انتقال بھی وہیں ہوا اور اپنی بنوائی ہوئی مسجد میں مدفون ہے۔

ایک مرتبہ نظیری نے خانخاناں سے کہا کہ اس نے ایک لاکھ اشرفیاں ایک جگہ نہیں د یکھی ہیں۔ خانخاناں نے ایک لاکھ اشرفیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ نظیری نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ کی بدولت ایک لاکھ اشرفیاں دیکھنا نصیب ہوا۔ خانخاناں نے اشرفیوں کا وہ ڈھیر نظیری کو پیش کردیا اور کہا میرا نہیں اب خدا کا شکر ادا کرو۔

☆ خانخاناں سپاہیوں کی تنخواہ کے رجسٹر پر دستخط کر رہا تھا۔ ایک سپاہی کے خانہ میں غلطی سے ہزار دام کی بجائے ہزار روپے لکھے گئے۔ دیوان نے غلطی کی

طرف توجہ دلائی۔ خانخاناں نے کہا ۔ رہنے دو جو لکھا گیا سو لکھا گیا۔ یہ اس کی قسمت کا تھا۔

☆ ایک مرتبہ خانخاناں ہاتھی پر سوار بازار سے گزر رہا تھا۔ راستہ میں ایک غریب شخص حاضر ہوا۔ ایک شیشی میں چند بوند پانی ڈال کر خانخاناں کو دکھایا اور پھر شیشی کو الٹ دیا۔ جب پانی گرنے کے قریب ہوا تو شیشی کو پھر سیدھا کر دیا۔ خانخاناں نے اسے انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ مصاحبوں نے اس کا مطلب پوچھا خانخاناں نے جواب دیا۔ وہ آدمی کسی شریف گھرانہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا مطلب تھا۔ چند بوند آبرو بچی ہے پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی گرنے والی ہے۔

☆ ایک دن خانخاناں گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ کسی نے پتھر پھینک کر مارا۔ سپاہیوں نے مارنے والے کو پکڑ لیا اور سامنے پیش کیا۔ حکم ملا۔ ایک ہزار اشرفیاں اسے دے دی جائیں۔ سب حیران کہ جو سزا کا مستحق تھا اسے انعام دیا جا رہا ہے۔ پوچھنے پر خانخاناں نے جواب دیا۔ لوگ پھل دار درخت پر پتھر مارتے ہیں۔ اس نے مجھے پھلدار درخت سمجھا۔ میرا جو پھل ہے وہ اسے دینا مناسب ہے۔

☆ خانخاناں مداحوں کے بیچ گھرا ہوا بیٹھا تھا۔ اک معمولی آدمی بھی وہاں آکر بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے اپنی جگہ بناتا ہوا خانخاناں کے قریب پہنچ گیا۔ چپکے سے لوہے کا ایک وزنی گولہ خانخاناں کی طرف لڑھکایا۔ نوکر اسے پکڑنے کے لیے اس کی طرف دوڑے۔ خانخاناں نے منع کیا اور کہا کہ لوہے کے برابر سونا اسے دے دو۔ مصاحبوں نے حیرانی سے پوچھا ایسا کیوں۔ جواب میں خانخاناں نے یہ شعر پڑھا۔

آہنِ کہ بپارس آشنا شد
دین مال بہ صورت طلا شد

(لوہا کسوٹی سے چھوتا ہے تو سونا ہو جاتا ہے)

☆ اس زمانہ میں بادشاہ اور امرا جدت طرازی کی قدر کرتے تھے۔ ذہانت اور حاضر جوابی کا انعام ملتا تھا۔ اہل علم کے پاس اہل دولت تک پہنچ کے یہ ذریعے تھے۔ ایک غریب برہمن خانخاناں کے دروازے پر آیا۔ دربان نے روکا۔ برہمن نے کہا کہ خانخاناں سے جا کر کہو کہ اس کا ہم زلف ملنے آیا ہے۔ خانخاناں نے برہمن کو اندر بلا لیا اور پوچھا بھئی یہ ہم زلف کا رشتہ کیا ہے۔ برہمن نے جواب دیا بپتا (ناداری) اور سمپتا (دولت) دو سگی بہنیں ہیں۔ پہلی میرے گھر آئی اور دوسری کو خانخاناں بیاہ لایا۔ اس طرح دونوں آپس میں ہم زلف ہوئے۔ خانخاناں یہ سن کر لطف اندوز ہوا اور برہمن کو بہت سا روپیہ دے کر رخصت کیا۔

☆ جہانگیر تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ خانخاناں بھی ساتھ تھا۔ ایک بھاٹ برابر جملے بازی کر رہا تھا۔ مقصد بادشاہ کا التفات حاصل کرنا تھا۔ مگر اس کی بیجا حرکتوں کی وجہ سے بادشاہ کو غصہ آگیا۔ جہانگیر نے حکم دیا۔ بھاٹ کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے پھینک دیا جائے۔ بھاٹ رونے چلانے لگا۔ اور بولا "حضور! میں ایک معمولی آدمی ہاتھی کیا کرے گا۔ میرے لیے تو چڑے یا چوہے کا پاؤں کافی ہے۔ ہاتھی کا پاؤں تو خانخاناں جیسے بڑے آدمی کے لیے چاہئے۔" بھاٹ کی دلچسپ بات سن کر بادشاہ زیر لب مسکرایا اور اس نے سوالیہ نگاہوں سے خانخاناں کی طرف دیکھا۔ خانخاناں کچھ دیر کے لیے اُلجھن میں پڑ گیا۔ سوچ کر جواب دیا۔ "اگر بادشاہ سلامت بھاٹ کی خطا معاف کردیتے ہیں تو اسے میری طرف سے پانچ ہزار روپیہ انعام میں دے دیا جائے۔ کسی نے پوچھا ایسا کیوں؟ خانخاناں نے جواب دیا" اس لیے کہ وہ مجھے بڑا آدمی سمجھتا ہے۔" بادشاہ اس جواب سے خوش ہوا اور بھاٹ کو معاف کر دیا۔ خانخاناں نے بھاٹ کو پانچ ہزار روپیہ انعام میں دے دیے۔

☆ ایک مرتبہ خانخاناں کو ایک مصور نے ایک تصویر پیش کی جس میں ایک عورت نہا کر کرسی پر بیٹھی ہے اور بالوں کو سکھا رہی ہے۔ ایک باندی اس کے پاؤں

دُھلا رہی ہے۔ خانخاناں نے تصویر دیکھی اور مصور کو پانچ ہزار روپیہ انعام میں دینے کا حکم دیا۔ مصور نے کہا کہ انعام تو اس وقت لوں گا جب حضور یہ فرمائیں گے کہ اس تصویر میں وہ کون سی خوبی ہے جس کی وجہ سے تصویر انعام کی مستحق قرار پائی۔ خانخاناں نے کہا کہ اس عورت کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ ہے جو پاؤں میں گدگدی کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ مصور نے تسلیم کیا اور سمجھ گیا کہ خانخاناں کو اچھے آرٹ کی پرکھ ہے جو اس کا مقصد بھی تھا۔ اس نے انعام قبول کرلیا۔

☆ **خانخاناں** دربار کو جا رہا تھا۔ ایک سوار، سپاہ گری کے ہتھیاروں سے آراستہ عجیب و غریب ہیئت بنائے سامنے آیا۔ اس کی پگڑی میں دو میخیں بندھی ہوئی تھیں۔ خانخاناں نے پوچھا کیا چاہتے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ نوکری، خانخاناں نے پھر پوچھا۔ ان میخوں کا کیا مطلب ہے۔ اس نے عرض کیا۔ ایک اس مالک کے واسطے ہے جو نوکر رکھے اور تنخواہ نہ دے اور دوسری میخ اس نوکر کے واسطے ہے جو تنخواہ لے اور کام نہ کرے۔ خانخاناں خوش ہوا اور اسے اپنے ساتھ دربار میں لایا اور سے سوال کیا۔ ایک انسان کی عمر طبعی کتنی ہوتی ہے۔ اس نے کہا ایک سو بیس برس۔ خانخاناں نے اس کی عمر بھر کی تنخواہ اسے پیشگی دے دی اور کہا حضرت اب ایک میخ تو پگڑی سے نکال دیجئے۔ دوسری میخ کا اختیار خود آپ کو ہے۔

☆ **خانخاناں** کو دعوتیں کرنے کا بڑا شوق تھا۔ انواع و اقسام کے کھانے دسترخوان پر سجے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی رکابیوں کے نیچے اشرفیاں بھی رکھ دیتا تھا کہ جس کا جو نصیب۔ ایک بار کھانے کی ایسی ہی محفل آراستہ تھی۔ ایک ملازم جو نیا نیا ملازمت میں رکھا گیا تھا۔ اچانک رونے لگا۔ خانخاناں نے رونے کا سبب پوچھا۔ نوکر نے جواب دیا۔ میرے والد کو بھی دعوتیں کرنے کا شوق تھا اور اسی طرح محفل آراستہ کیا کرتا تھا۔ یہ محفل دیکھ کر مجھے اپنے والد کی یاد آگئی۔ خانخاناں کو بھی

دکھ ہوا۔ ایک بھنا مرغ سامنے رکھا تھا۔ اس سے پوچھا اچھا بتاؤ مرغ میں سب سے زیادہ لذیذ کون سی چیز ہوتی ہے۔ نوکر نے جواب دیا پوست یعنی کھال۔ خانخاناں کو یقین ہوگیا کہ واقعی یہ خاندانی آدمی ہے۔ اور سچ بولتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھایا۔

☆ ایک مرتبہ خانخاناں دربار شاہی سے برہان پور جاتے تھے۔ راستہ میں خیمہ زن ہوئے شام کو خیمہ کے باہر محفل آراستہ ہوئی۔ مصاحب اورامرا چاروں طرف جمع تھے۔ ایک درویش ادھر سے گزرا۔ اس نے خانخاناں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر صدا بلند کی اور یہ شعر پڑھا۔

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارہگاہ ساخت

(جنگ ہو کہ بیاباں دولت مند لوگ ہر جگہ امیر ہی ہوتے ہیں۔
جہاں جاتے ہیں جنگل میں منگل کا سماں پیدا ہوجاتا ہے۔)

خانخاناں کو یہ شعر پسند آیا۔ اس لیے بھی کہ اکثرلوگ خانخاناں کومنعم کے نام سے پکارتے تھے۔ حکم دیا کہ درویش کو ایک لاکھ روپیہ دے دو۔ دوسرے دن وہ فقیر پھر وہاں سے گزرا اور یہی شعر پڑھا۔ خانخاناں نے پھر ایک لاکھ روپیہ دے دیا۔ سات دن تک وہ برابر آتا رہا اور خانخاناں اسے ایک لاکھ روپیہ دیتا رہا۔ آٹھویں دن وہ نہیں آیا۔ سوچا ہوگا کہ معلوم نہیں کیا ہو۔ ہوسکتا ہے وہ ڈر رہا ہے کہ میرا دیا ہوا روپیہ واپس نہ لے لے۔ اس لیے آٹھویں دن وہ نہیں آیا۔ خانخاناں خیمہ کے باہر کرسی بچھائے دیر تک درویش کا انتظار کرتا رہا۔ جب ناامید ہوگیا تو درباریوں سے بولا:

"آگرہ سے برہان پور ۲۷ منزل ہے۔ میں نے ۲۷ لاکھ روپے خزانہ سے منہا کردیے تھے اب اس کا نصیب۔ پست

حوصلہ تھا۔ اتنے پر ہی قناعت کر گیا۔"

خانخاناں کی سیرت و شخصیت کے اور بھی پہلو ہیں۔ علم و ادب اور تصوف سے اس کی دلچسپی، اس کی بنائی ہوئی عمارتیں، باغات، سرائے، تالاب اور خاص طور پر حضرت شیخ احمد سرہندی سے اس کی مراسلت اس کی شخصیت کے کئی نامعلوم گوشوں پر سے پردہ اٹھاتے ہیں جن کا ذکر ہم نے علاحدہ ابواب میں کیا ہے۔

☆☆
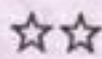
# علم و ادب اور تصوف

## علم و ادب

**ایک مرتبہ** عرب کے ایک عالم کے چند خطوط اکبر کے نام آئے جو حجازی بولی میں لکھے ہوئے تھے اور جسے عرب بھی مشکل سے سمجھتے تھے۔ یہ خطوط دربار کے اہل علم میں سے کوئی بھی نہ پڑھ سکا۔ ابوالفضل گیلانی تک نہ پڑھ سکے۔ خانخاناں کو جب وہ خطوط دے گئے تو اس نے نہ صرف پڑھے۔ بلکہ ایک ایک لفظ کا ترجمہ بھی کر دیا اور بے ساختہ خطوں کا مضمون فارسی میں سنا دیا۔

**خراسان** کے لیے سفیر بھیجا جا رہا تھا۔ اکبر کے حکم سے خانخاناں نے خراسان کے بادشاہ کے نام خط کا مسودہ تیار کیا۔ بادشاہ کی منظوری سے پہلے یہ مسودہ اصلاح کی غرض سے کئی علما کو دکھایا گیا مگر کوئی بھی اس میں ایک لفظ گھٹا بڑھا نہیں سکا۔ بلکہ سب نے مسودہ کی تعریف کی اور کہا کہ پوری سلطنت میں کوئی ایسا منشی نہیں جو اس طرح کا مدبرانہ خط لکھ سکتا ہو۔ جب خط بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے بھی پسند کیا اور جب خراسان کے دربار میں پڑھ کر سنایا گیا تو وہاں بھی خط کی بڑی تعریف ہوئی ۔ کہتے ہیں سرکاری خطوں کے مسودہ تیار کرنے میں خانخاناں کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

**خانخاناں** کے گھر پر ادبی و علمی نشستوں و محفلوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ یہی محفلیں ہمارے آج کے مشاعروں کا پیش رو تھیں۔ بعض اوقات مصرع طرح بھی

دیا جاتا تھا۔ ایک بار غزل کا مصرع طرح دیا گیا جس کا قافیہ چند است، پند است، فرزنداست تھا۔ خانخاناں نے بھی اس طرح میں غزل لکھی اور پڑھ کر سنائی اور جو پسند کی گئی۔ خانخاناں کی غزل کے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

شمار شوق ندانستہ ام کہ تاچند است
جز ایں کہ دلم سخت آرزو منداست
بہ کیش صدق و صفاحرف عہد بیگانہ است
نگاہ اہل محبت تمام سو گند است

خانخاناں عربی، ترکی، فارسی اور ہندی زبانیں تو جانتا ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے سندھی زبان بھی آتی تھی اور اکبر کے حکم سے اس نے یورپی زبانیں بھی سیکھنا شروع کیا تھا۔ انگریزوں اور ولندیزیوں سے اس کے تعلقات تھے اور کئی معروف سیاح اس سے ملے بھی تھے۔ ذخیرہ الخوانین میں لکھا ہے کہ وہ فارسی، ہندی اور سندھی زبانو ں میں بہترین شاعری کرتا تھا اس کے انتقال کے بعد ہندی زبان کا ایک مسودہ اس کے کتب خانہ سے ملا تھا جس کی قیمت اس وقت ۵۰ ہزار روپے تھی۔ اس پر سونے کا کام تھا اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

سورت جو یوروپی قوموں کا مرکز تھا۔ بہت عرصہ تک خانخاناں کے زیر انتظام رہا۔ اس لیے ممکن ہے کہ یورپی زبان میں کچھ شُد بُد پیدا ہو گئی ہوگی۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کی ترکی دانی پر گرفت کی ہے اور لکھا ہے کہ اپنے ملازموں سے ترجمہ کرا کر بادشاہ کے سامنے پیش کردیا۔ اگرچہ ترجمہ نگرانی میں بھی کرایا گیا تب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خانخاناں ترکی زبان سے نابلد تھا۔ کسی کام کی نگرانی کے لئے بھی ضروری ہے کہ نگراں کی اس کام پر دسترس بھی ہو۔

شبلی نعمانی نے خانخاناں کے بارے میں لکھا ہے:

"وہ امرائے اکبری کا گل سر سبد تھا، اس زمانہ میں وہی ایک شخص تھا

جس کے تاج فخر پر صاحب السیف والقلم کا طرہ زیب دیتا تھا......
وہ شاعری میں پڑتا تو عرفی اور نظیری کا ہمسر ہوتا۔ خانخاناں کی
فیاضی اور قدردانی سے جو شعرا اور اہل کمال اس کے دربار میں جمع
ہوگئے تھے۔ سلاطین کو بھی یہ بات نصیب نہ ہوئی۔ ان کی شاہانہ
فیاضیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں نے شعر و شاعری کے حق میں ابر کرم
کا کام کیا۔"

علم و ادب سے خانخاناں کی وابستگی کا علم مآثر رحیمی سے ہوتا ہے۔ یہ اس کی سوانح ہے جسے اس کی فرمائش پر عبدالباقی نہاوندی نے تصنیف کیا۔ یہ سوانح خانخاناں کی حیات میں ۱۶۱۶ء میں مکمل ہوگئی تھی۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل اور تین ہزار سے زائد صفحوں پر محیط ہے اس کا ایک مستند اور اولین اڈیشن ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا تھا۔ مآثر رحیمی خانخاناں سے زیادہ معاصر شعرا فضلا اور حکما کا تذکرہ ہے۔ ایک سو سات شعرا کا ذکر اور ان کا انتخاب کلام مآثر میں دے دیا گیا ہے جو خانخاناں کے دربار سے وابستہ تھے۔ نہاوندی نے خانخاناں کے ایک فارسی دیوان کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر دیوان ابھی تک کہیں دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ اس کے محاسن کلام کا اندازہ انہیں غزلوں، رباعیوں سے ہوتا ہے جو مآثر رحیمی میں درج ہیں۔

عبدالباقی نہاوندی کا باپ شاہ ایران عباس صفوی کے امرا میں شامل تھا۔ ہمدان کے قریب مقام نہاوند کا رہنے والا تھا۔ باپ پر عتاب نازل ہوا، اور خاندان پر برے دن آئے تو عبدالباقی نے ہندستان کا رخ کیا۔ عبدالباقی نہاوندی پہلے سے خانخاناں سے واقف تھا۔ سنا ہے خانخاناں کی تعریف میں کئی قصیدے لکھ کر روانہ کئے تھے اس لیے وہ سیدھا ایران سے چل کر خانخاناں کی خدمت میں پہونچا اور اسے سوانح لکھنے پر مامور کیا گیا۔ جس طرح اکبر نامہ اور آئین اکبری لکھ کر

ابوالفضل نے اکبر کی زندگی کو دوام بخشا اسی طرح عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی لکھ کر عبدالرحیم خانخاناں کو زندہ جاوید بنا دیا اور خود بھی امر ہو گیا۔

مآثر رحیمی خانخاناں کی سوانح سے زیادہ ہم عصر عہد کی تاریخ ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ معاصر علما و شعرا کا تذکرہ ہے اوراس میں زیادہ تر انہیں اہل کمال کا ذکر ہے جو خانخاناں کے دربار سے وابستہ تھے، خانخاناں کے خاندانی حالات، غزنویوں، سلاطین بنگال اور شرقی سلاطین ، مالوہ و مانڈو، کشمیر و سندھ اور گجرات کے فرمانرواؤں کے حالات، اس کے بعد بابر سے لیے کر جہانگیر تک کے حالات زندگی اس کتاب میں ملتے ہیں۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ایک سو سات شعرا خانخاناں سے وابستہ تھے وہ باقاعدہ اس کی ملازمت میں تھے اور جنہیں خزانے سے تنخواہ ملتی تھی یا انہیں جاگیریں عطا ہوتی تھیں اطباء وحکما اورعلما ان کے علاوہ تھے وہ بھی وظیفہ خوار تھے۔ صرف چند شعرا کا ذکر یہاں کرتے ہیں جو اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے اس عہد میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔20ے

عرفی شیرازی کا نام سب سے اہم ہے۔ وہ شاعری میں بھی بلند مقام رکھتا تھا۔ ایران اور ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہاں کے شرفاء میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ خود پرست اور مغرور بھی تھا۔ مصوری کا شوق رکھتا تھا۔ اس کے ہندوستان آنے کی وجہ جذبۂ عشق بتایا جاتا ہے، وہ شہزادہ سلیم پر غائبانہ عاشق ہو گیا تھا۔ شہزادہ کے حسن و جمال کے قصے سنے تھے۔ شاید کوئی تصویر بھی دیکھی ہو۔ وہ اپنے معشوق سے ملنے کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ معشوق بھی کون؟ مغلیہ سلطنت کا ولیعہد اور ہندوستان کا ہونے والا بادشاہ۔ ابتدا میں اس نے فیضی کی ملازمت اختیار کی مگر اس کے ساتھ زیادہ دن نبھ نہ سکی۔ بقول ملا بدایونی فیضی کے ساتھ کوئی بھی شخص زیادہ دن نبھا نہیں سکتا تھا۔ بہر حال اس کے بعد عرفی نے ابوالفتح گیلانی کی ملازمت اختیار کرلی جس کا شمار اکبر کے نورتنوں میں ہوتا تھا اور وہ بھی داد و

دہش میں خانخاناں سے کم نہ تھا۔ اس کے ساتھ بھی زیادہ دن گذارا نہیں ہو سکا۔ آخر میں وہ خانخاناں کے دربار سے وابستہ ہوگیا اور عمر بھر اسی کے ساتھ رہا۔ خانخاناں کی سرپرستی نے اسے مالی پریشانیوں سے آزاد کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس کی شاعری میں نکھار اور جلا پیدا ہوئی۔ وہ تھا بھی باکمال شاعر اسی لیے لوگ اس کے نخرے برداشت کرتے تھے۔

شہزادہ سلیم نے اسے دربار میں بلایا۔ وہ جانتا تھا کہ عرفی میرا عاشق ہے۔ شاعر قصیدہ لکھ کر دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ مراد پوری ہوتی ہے۔ سراپا اشتیاق ہے۔ دربار میں پہنچ کر شہزادہ کے سامنے زمین بوس ہوتا ہے۔ نگاہ رخ جمال پر پڑتی ہے، عجیب کیفیت ہے۔ ان کیفیات کو قصیدہ میں موتیوں کی طرح پرو کر لیجاتا ہے۔ نہایت لطیف پیرائے میں کہتا ہے کہ اگر میں ادب سے رک نہ جاتا تو بجائے اس کے کہ میرے لب اس کے قدم چومتے۔ اس کے قدم میرے لب چوم لیتے۔ عرفی اس ملاقات کا حال اسی طرح بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ ہر شعر میں ایک سچے عاشق کی وارفتگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ محبوب اور ممدوح دونوں ایک ہی شخص ہے۔ پھر شاعر بھی خودی اور پندار کی زنجیروں میں جکڑا ہے۔ خود اپنے وقار کو بھی برقرار رکھتا ہے اور اظہار عشق بھی اس پیرایہ میں کرتا ہے کہ شہزادہ کو ناگوار نہ گرے۔ بعض مقامات پر اظہار بہت نمایاں ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔

> ''باوجودیکہ شہزادہ نے کچھ نہیں کہا اور میں نے سب کچھ سن لیا۔
> اس کی نگاہ میں ساری تقریر تھی۔ اور جب آخر کار بات نگاہ سے
> گذر کر لبوں تک پہنچی تو میرے کان کوثر و تسنیم کے رس میں
> ڈوب گئے۔''

شیخ سعدی نے ایک قطعہ لکھا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ اس شاعر کو عاشقی کا نام نہیں لینا چاہیے جو قصیدہ میں دو چار عشقیہ شعر لکھ کر عاشقی کا دعویٰ کرتا ہے۔

عرفی نے ایک طرح سے اس قطعہ کا جواب لکھا ہے جس میں شہزادہ سلیم کے تئیں اپنے عشق کی طرف بڑا لطیف اشارہ کیا ہے وہ لکھتا ہے:

''سعدی گوممدوح کو معشوق پر ترجیح نہیں دیتے۔ ٹھیک ہے ان کا معشوق اور ہے اور ممدوح اور۔ لیکن میری مشکل تو یہ ہے کہ میرا ممدوح بھی وہی ہے جو میرا معشوق ہے۔''

عرفی کی بدمزاجی کی وجہ سے لوگ اس سے ناراض رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ذاتی دشمنی کی وجہ سے کسی نے اسے زہر دلا کر ہلاک کر دیا۔ لاہور میں دفنایا گیا۔ بعد میں اس کی ہڈیوں کو قبر سے نکال کر نجف لے جا کر دفنایا گیا۔

ایک دوسرا قابل ذکر شاعر جس کا خانخاناں سے تعلق رہا نظیری نیشاپوری تھا۔ وہ اپنے زمانہ کا ممتاز شاعر تھا۔ خراسان میں جب اس نے اپنی شاعری کا لوہا منوالیا تو اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ اصل وجہ تو خانخاناں کی فیاضی اور شاعروں کی سرپرستی کا شہرہ تھا جو دوسرے شاعروں کی طرح اسے بھی ہندوستان کھینچ لایا تھا۔ خانخاناں کے کیریر کے ابتدائی زمانہ میں جب وہ گجرات کی مہم کو فتح کر کے آگرہ لوٹا تھا نظیری اس سے آکر ملا اور قصیدہ پیش کیا۔ اس وقت رحیم کو خانخاناں کا خطاب ملا تھا جس کا ذکر اس نے اپنے قصیدہ میں کیا ہے۔ خانخاناں کے توسط سے ہی وہ اکبر کے دربار تک پہنچا مگر وہاں اسے زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ اس لیے اپنا تعلق خانخاناں سے رکھا۔ اس نے احمد آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اس نے سفر حج کیا جس کے تمام اخراجات خانخاناں نے برداشت کیے۔ حج سے واپسی پر اس کا تعلق شہزادہ مراد سے ہوگیا۔ شہزداہ مراد دکن کی مہم پر جارہا تھا کہ گھومتا پھرتا نظیری بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے کچھ قدردانوں اسے مراد کے سامنے پیش کیا۔ جشن نوروز منایا جارہا تھا۔ دربار سجا تھا۔ وہاں کی آن بان کو دیکھ کر نظیری کے ہوش اڑ گئے اور وہ سجدہ کرنا بھی بھول گیا۔ جہانگیر سے بھی اس کا تعلق رہا اور اس کی شان میں قصیدے لکھے۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے سنار تھا اور تاجر تھا اور

امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا امرا میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ آخیر عمر میں وہ دینی علوم کی طرف مائل ہوا۔ وہ خانخاناں کے ساتھ دکن کی مہم پر جا رہا تھا جہاں مانڈو میں اس کی ملاقات شیخ غوثی مانڈوی سے ہوئی جس سے اس نے عربی زبان سیکھی اور حدیث و تفسیر پڑھی۔ وہ اکبر کے مذہبی خیالات کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اخیر عمر میں تارک الدنیا ہوگیا تھا اسی عمر میں احمد آباد سے آگرہ تک سفر کیا، جس کا مقصد اپنا دیوان خانخاناں کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ وہ تمباکو نوشی کا عادی تھا اگرچہ جہانگیر نے تمباکو پر پابندی عائد کر دی تھی مگر وہ پھر بھی پیتا تھا۔ اس نے تمباکو کی تعریف میں ایک غزل بھی لکھی۔ احمد آباد میں وفات پائی۔ اپنے مکان کے قریب ایک مسجد تعمیر کرائی تھی اسی میں دفن ہوا۔ نظیری کی قبر جس محلہ میں تھی اس کا نام تاجپورہ تھا۔ قبر پر ایک گنبد بھی بنا ہوا تھا۔

وہ اگرچہ مختلف درباروں سے وابستہ رہا اس نے زیادہ تر قصیدے خانخاناں کی شان ہی میں لکھے، خان اعظم کی تعریف میں بھی ایک قصیدہ لکھا۔ ہم عصر شعرا جیسے عرفی، شکیبی، انیس وغیرہ سے معرکے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ خانخاناں نے انیس کو ایک خط لکھا جس کے حاشیہ میں نظیری کو بھی سلام لکھا۔ نظیری کو ناگوار گذرا اور ایک قصیدہ میں خانخاناں کو اس کی شکایت لکھی۔

ایک اور شاعر خانخاناں کے تعلق سے جس کا ذکر اکثر آتا ہے مولانا شکیبی ہے۔ وہ اصفہان کا رہنے والا تھا۔ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ اچھا شاعر بھی تھا۔ سندھ میں خانخاناں سے آکر ملا اور خراج تحسین پیش کیا۔ ساقی نامہ لکھ کر پیش کیا۔ خانخاناں نے بارہ ہزار روپے۔ ایک خلعت اور ایک گھوڑا انعام میں دیے۔ حج پر جانے کا ارادہ ظارہ کیا تو اتی ہزا اخراجات کے لیے مرحمت فرمائے۔ اخیر عمر میں وہ جہاں گیر سے وابستہ ہوگیا وار آگرہ میں انتقال ہوا۔

مولانا مظہری کشمیری بھی خانخاناں کے خوشہ چین تھے۔ وہ پہلے ہندستانی تھے جو ایران، عراق اور خراسان کی سیاحت کے لیے نکلے، اور ان ممالک میں اپنی

شاعری کی داد حاصل کی۔ مآثر رحیمی کے مطابق اب تک ایسی مثال نہیں ملتی کہ ہندوستانی شاعر باہر جا کر اپنی شاعری کا سکّہ جمائے یہ عزت مظہری کو حاصل ہوئی۔ سیر و سیاحت کے بعد ہندوستان آکر اکبر کی ملازمت اختیار کی۔ نعت گوئی میں خاص شہرت حاصل ہوئی خانخاناں سے وابستہ رہے اور اس کی تعریف میں متعدد قصیدے لکھے۔ اخیر میں کشمیر میں گوشہ نشین ہوگئے اور وہیں انتقال ہوا۔

ہم نے ان چند شعرا کا ذکر کیا جن کا شہرہ تھا اور جو درباروں کی زندگی میں زیادہ دخیل تھے۔ یہ فہرست تو بہت طویل ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے ایک سو سات شعرا خانخاناں سے وابستہ تھے۔ اطبا و حکما اور علما ان کے علاوہ تھے۔ خواجہ حسین ثنائی تھے جو ایران سے اس لیے بھاگ آئے تھے کہ ایک قصیدہ جو اس نے شاہ ایران کی شان میں لکھا تھا اس میں بادشاہ کا نام نہیں تھا۔ وہ اکبر بادشاہ اور حکیم ابوالفتح سے وابستہ رہا بعد میں خانخاناں اس کا مربی بن گیا۔ وہ زیادہ ترقی نہیں کرسکا کیوں کہ اس میں جلن اور حسد بہت تھا۔ مولانا محتشم کاشانی بھی ایران کا درباری شاعر تھا اور ناقدری کی وجہ سے ہندوستان چلا آیا تھا۔ ان کے علاوہ ظہوری، مولانا ملک ، ملہی شیرازی، حیدر رفعی، محب علی سندی، اسماعیل بیگ انسی، نوعی خراسانی، مولانا تقیاوی شوستری، حیاتی گیلانی، باقر کاشانی وغیرہ وغیرہ شعرا تھے جو خانخاناں کی سرپرستی اور فیاضی میں پروان چڑھے۔

دراصل تعریف اور بے جا خوشامد اس زمانہ کا مزاج تھا۔ شاعری بھی بال کی کھال نکالنے کے مترادف تھی۔ معنی آفرینی تخیل آرائی، بے بات سے بات پیدا کرنا، ترکیب و محاورے، صنائع و بدائع کی کثرت سے زبان کو بوجھل بنانا، سبھی شعرا میں ایک جیسی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ یکسانیت اس زمانے کی عام خصوصیت تھی۔ چند شعرا مستثنیٰ ضرور تھے۔ مگر یہ عام چلن تھا۔ ہر شاعر قصیدہ خوانی ضرور کرتا تھا۔ انہیں اس کے لیے روپیہ اور انعام و اکرام ملتا تھا۔ اس کی وجہ سے جھوٹی تعریف اور بے جا خوشامد جیسی برائیاں مزاج کا حصہ بن گئیں۔ ان میں سے زیادہ

تر اہل قلم ایران ، عراق اور خراسان سے ہندستان آئے تھے۔ ان میں سے کچھ آزاد پیشوں سے بھی وابستہ تھے۔ کچھ نے سپہ گری کو پیشہ بنا لیا تھا۔ مگر زیادہ تر سرکاری خزانہ سے تنخواہ پاتے تھے۔ بعض کوشہزادے یا امرا یا بادشاہ اتنی جاگیر دے دیتے تھے کہ انہیں پھر کچھ کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ بلاشبہ ان کی سرپرستی سے ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوا مگر معاشرہ میں بہت سی برائیاں بھی راہ پا گئیں۔ جو آگے چل کر اردو زبان و ادب کو ورثہ میں ملیں اور آج بھی ہمارے مزاج کا حصہ ہیں۔

مغلوں کو کتابوں کے مطالعہ سے خاص دل چسپی تھی۔ ان کے اپنے ذاتی کتب خانے تھے ہمایوں نے شیر شاہ کے بنوائے قلعہ (پرانا قلعہ) میں ایک لائبریری قائم کی تھی جس کی سیڑھیوں سے گر کر اس کی موت ہوئی۔ گجرات کی مہم کے دوران ہمایوں کھمبات کے مقام پر خیمہ زن تھا کہ کچھ پہاڑی قبیلوں نے اس کے کیمپ کو تاراج کردیا۔ خیمہ میں کچھ نادر کتب بھی تھیں ۔ جو قبائلی لے گئے اور جس کا بادشاہ کو بڑا دکھ ہوا وہ یہ کتابیں ہروقت مطالعہ میں رکھتا تھا۔ اکبر کو بھی کتابوں سے گہری دل چسپی تھی۔ اس کے کتب خانے میں چوبیس ہزار کتابیں اور مخطوطات تھے۔ مغل نہ صرف یہ کہ کتابوں سے شوق رکھتے تھے۔ انہیں عوام کے لیے کتب خانے کھولنے اور دارالمطالعہ بنانے سے بھی دلچسپی تھی۔ عبدالرحیم خانخاں نے احمد آباد میں دارالحکمت قائم کر کے ایک اہم قدم اٹھایا۔

خانخاناں نے یہ ادارہ ذاتی کتب خانے کے طور پر قائم کیا تھا دھیرے دھیرے اس کتب خانہ کی شہرت ساری علمی دنیا میں پھیل گئی ۔ اس کتب خانے میں ہرفن کی نادر کتب جمع کی جاتی تھیں زیادہ تر کتب خود مصنفین کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوتی تھیں۔ ہر شاعر کی یہ خواہش رہتی تھی کہ کسی طرح ان کا دیوان اس کتب خانے کی زینت بن جائے۔ عرفی نے خانخاناں سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کے کلام کو مرتب کر کے کتب خانے میں جمع کردے

خانخاناں سے جتنے شعرا وابستہ تھے ان کے دیوان ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کتب خانہ میں موجود تھے۔ یہ صرف کتب خانہ ہی نہ تھا بلکہ شعر و شاعری کا مرکز تھا۔ یہاں محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ طرحیں دی جاتی تھیں۔ جن پر شعرا غزلیں لکھ کر سناتے تھے۔ خود خانخاناں ان ادبی نشستوں میں حصہ لیتا۔

کتب خانہ میں ایک سو سے زائد ملازم کام کرتے تھے۔ کتابوں کی نگرانی کے علاوہ یہاں کتابت کا کام بھی ہوتا تھا۔ مسودوں کو مصور کیا جاتا۔ ان کی جلد بندی کی جاتی۔ مرقعے تیار ہوتے تھے۔ کتابوں کی لوح پر طلاکاری کا کام کیا جاتا۔ یہاں کام کرنے والے اہل فن کو زریں رقم، عنبریں قلم، روشن رقم، شیریں رقم، مشکل رقم وغیرہ جیسے خطابات سے نوازا جاتا۔

اولاً یہ کتب خانہ سرونج مالوہ کے مقام پر تھا۔ آقا محمد شیرازی اس وقت کتب خانہ کا داروغہ تھا۔ بعد میں اسے احمد آباد لایا گیا۔ اس لائبریری کا قیام ۱۵۸۳ء کے آس پاس عمل میں آیا تھا۔ ملا محمد حسین ہروی ۳۵ سال تک لائبریری کا ملازم رہا۔ مولانا ابراہیم نقاش کتب خانہ کا ناظم یا معتمد تھا۔ میر باقی ماورالنہری ترقی کرتے کرتے داروغہ یعنی لابریرین کے عہدہ تک پہنچا برج بھاشا کا مشہور شاعر شیخ برہمی بہرائچی بھی کتب خانہ میں ملازم تھا۔ وہ بھی ترقی کر کے داروغہ بنا۔ جب وہ ہندوستان چھوڑ کر جانے لگا تو اس نے اپنے بیٹے عبدالسلام کو خانخاناں کی سرپرستی میں دے دیا۔ بڑا ہونے پر اسے بھی کتب خانہ کا داروغہ مقرر کیا گیا۔

شجاع ہرات کا رہنے والا تھا۔ وہ نسخ اور ثلث خطوں میں ماہر تھا۔ خانخاناں سے ٹھٹھہ کے مقام پر ملا تھا۔ وہ بھی کتب خانہ میں ملازم تھا اور ترقی کر کے داروغہ کے عہدہ تک پہنچا۔ ملا عبدالرحیم ہرات سے آیا تھا۔ وہ نسخ اور نستعلیق کا ماہر تھا۔ وہ بھی کتب خانہ میں ملازم تھا۔ خطاط اور کاتب مسودوں کے نقل کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے جلد ساز، مصور، کاغذ تراش اور

مقابلہ نویس بھی ملازم تھے۔ مسودوں کو طرح طرح لکھا جاتا اور سجایا جاتا تھا۔ کتب خانہ کا مشہور ملازم محمد امین خراسانی تھا جو ملمع سازی کا ماہر تھا۔ وہ مشہد کی ایک لائبریری میں کام کر چکا تھا۔ ہندوستان میں خانخاناں نے اسے کتب خانہ میں ملازم رکھا اور چار ہزار روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ وہ ابری کا موجد تھا۔ مانڈا نام کا ایک ہندو بھی ملازم تھا جو مصور تھا۔ اس کے علاوہ مادھو، فہیم، ندیم، مشفق بہبود وغیرہ بہت سے آرٹسٹ یہاں کام کرتے تھے۔ بہت سے مترجم بھی ملازم تھے۔ اور بعض اہل قلم تصنیف و تالیف کے لیے بھی مقرر تھے۔ مولانا صوفی اپنے زمانہ کا عالم اسی کام پر متعین تھا۔

آخر اس کتاب خانہ کا انجام کیا ہوا؟ ظاہر ہے انقلابات زمانہ کے ہاتھوں برباد ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں زیادہ تباہی ہوئی۔ بہت سے مخطوطے انگریز لے گئے۔ اس کے باوجود اس کتب خانہ کے نوادرات آج بھی ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر رامپور لائبریری، پٹنہ کی خدا بخش لائبریری، حیدرآباد کے کتاب خانوں، بانکی پور کی پبلک لائبریری اور کلکتہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں بہت سے نوادرات محفوظ ہیں۔

## رحیم کی فارسی شاعری کے نمونے

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند است
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است

(مجھے اپنی آرزوؤں کی گنتی نہیں معلوم سوائے اس کے کہ مرا دل ان آرزوؤں کا مرکز ہے۔

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیگانہ است
نگاہ اہل محبت تمام سوگند است

(محبت و خلوص کے مسلک میں کسی طرح کی قسم کھانا بیکار ہے۔

محبت کرنے والوں کی نگاہ سر سے پاؤں تک قسم ہے۔)

نہ دام دانم ونہ دانہ ایں قدر دانم
کہ شمتری چہ کس مست و بہاے من چند است

مدے حق محبت عنایتی ست زد دست
وگرنہ خاطر عاشق بیچ فرسنہ است

ازاں خوشم بسخنہا دلکش تو رحیم
کہ اند کے بادا ہائے عشق مانند است

زنہار رحیم از پے دل مزدے
بیہودہ بہ آرزوے دل در گردے
گفتم سخنے و باز ہم می گویم
خواہش کارے ہمیشہ کاہش دروے

میں جال کو جانتا ہوں نہ دانے کی قدر سے واقف ہوں، میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میرا خریدار کون ہے۔

محبت کے حق کی ادائیگی دوست کی عنایت ہے ورنہ عاشق کا دل تو دولت کی طرف سے کچھ نہ ملنے پر بھی خوش ہے۔

رحیم مجھے تیرے اشعار اس لیے پسند ہیں کہ ان میں عشق کی کچھ ادائیں پائی جاتی ہیں۔

رحیم تو ہرگز منزل کے پیچھے نہ جانا اور دلی تمناؤں میں خود کو گردی نہ کرنا

میں نے یہ بات کہی ہے اور پھر کہتا ہوں خواہش ایسا قدم ہے جس میں نقص اور کمی ہمیشہ موجود ہے۔

به دوستی که بجز دوستی نمی دانم
خدائے داند واں مرا خداوند است

(دوستی کو میں بجز دوستی کے اور کچھ نہیں جانتا، خدا ہی جانتا ہے اور وہ جو میرے لیے مالک کی حیثیت رکھتا ہے اور میرا محبوب ہے۔)

ادائے حق محبت عنایتے است زدوست
وگرنہ خاطر عاشق بہ ہیچ خرسند است

(اگر دوست حق محبت ادا کرے تو یہ اس کی عنایت ہے ورنہ عاشق کا دل تو تھوڑے میں بھی خوش رہتا ہے)

خیال آفت جان و خواب دشمن چشم
بلائے نیم شب است ایں نہ مہرو پیوند است

(خیال جان کی آفت (یعنی روح کے لیے مصیبت) اور خواب دشمن چشم ان سے محبت و قربت کا کوئی تعلق نہیں، ان کی حیثیت بلائے نیم شب کی ہے)

نہ زلف دانم و نہ دام ایں قدر دانم
کہ پائے تا بسرم ہر چہ ہست در بند است

(نہ میں زلف کو جانتا ہوں اور نہ دام کو صرف اس قدر جانتا ہوں کہ میرے سر سے پیر تک جو کچھ ہے وہ اس کی قید میں ہے۔)

ازاں خوشم بہ سخنہائے دلکش تو رحیم
کہ زندگی باداہائے دوست مانند است

(رحیم میں تمہارے دلکش کلام سے خوش ہوں کہ زندگی دوست کی

اداؤں کی مانند ہے۔)

تمام مہر و محبت شدم نمی دانم
کہ دل کدام و محبت کدام و یار کدام

(میں سراپا مہر و محبت ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ دل کہاں ہے، محبت کہاں ہے اور یار کہاں ہے)

در آفرینش تو قدسیاں دریں غلطند
کہ آفریدہ کدام، آفریدگار کدام

(ملائک تیری تخلیق میں غلطاں ہیں یعنی یہ جاننے کے لیے کہ مخلوق کون ہے اور خالق کون ہے)

چوں عشق پردہ بر انداخت می تواں دانست
کہ تازہ روے کدام است و شرمسار کدام

(جب عشق پردہ اٹھا دے گا تو اس وقت معلوم ہوگا کہ کون تازہ رہ ہے۔ یعنی کسی کی جبیں عرق ہائے ندامت سے خالی ہے اورکون احساس خطا سے شرمسار ہے۔)

متاع جور و جفا کر جہاں جہاں داری
بیا بیا کہ دلم می کند خریداری

(جور و جفا کا سامان دنیا میں جہاں جہاں ہو اسکو لے آؤ کہ میرا دل اس کا خریدار ہے)

گر بدل جویت فتد سروکار
ہمہ اعضائے من، دل آردبار

(اگر دل میں تیری محبت کی نہر آکر گرے تو میرے تمام اعضا سے

دل بصورت نظر آئے)

ہرچند نیست بزم وصال تو بارقیب
شرم تو باہزار نگہباں برابر است

(اگر چہ تیری بزم وصال رقیب کے ساتھ نہیں ہے لیکن اس کی وجہ محض یہ ہے کہ تیری حیا ہزار نگہبانوں کے برابر ہے۔)

نسیم وصل گویا می وزد کز کوئے یار اشب
کہ دل بانا امید یہا نمی گیرد قرار امشب

(آج کی رات نامیدی کے سبب سے دل بے قرار ہے کیوں کہ کوچہ یار سے جو ہوا چل کر آرہی ہے وہ نسیم وصال کی کیفیت لیے ہوئے ہے)

رحمے کن، ویک تیر بہ سوی جگر انداز
کاں تیر نخستیں کہ زدی برجگر آمد

(رحم کرو، ہاں ایک تیر اور جگر کی طرف پھینکو اس لیے کہ پہلا تیر جو تم نے مارا تھا وہ جگر سے باہر آگیا ہے)

تو کہ از عہدہ یک دل شدہ بیروں نائی
ہمہ خلق گرفتار چرا باید کرد

(تو کہ کبھی ایک دل کے سوا کسی دوسرے دل میں نہیں رہا پھر یہ تمام مخلوق کی گرفتاری کس لیے ہے؟)

## رباعیاں

اے ساقی بہ ہمہ محبت جامے — اے قاصد زغمزہ نہاں پیغامے
تا کے ہدف تیر تغافل باشم — لطفے، قہرے، بتسمے، دشنامے

(اے ساقی محبت سے ایک جام کر۔ اے قاصد اشارہ سے مخفی پیغام سنادے ۔ کب تک میں تیر تغافل کا شکار رہوں۔ کبھی لطف، کبھی قہر، کبھی تبسم تو کبھی دشنام۔)

جاسوس دلم بہ سوے لولوتو بس　　اسباب پریشانی من موئے تو بر
دربان محرماں ہمیں خوئے تو بس　　مشاط روئے تو ہمیں روئے تو بر

(میرا دل تو ترے ہی موتی کی جستجو میں ہے کسی اور کی جستجو نہیں، میری پریشانی کے اسباب تیرے بال ہیں، اس کے سوا کوئی اور نہیں، تیری خو ہی محرموں کی دربانی کے لیے کافی ہے اور کسی دربان کی حاجت نہیں ، ترے چہرے کی زینت ہی تیرے لیے مشاطہ ہے، کسی اور مشاطہ کی ضرورت نہیں۔)

دل دادم و باد آشنائی کردم　　در رہ روشش رہ نمائی کردم
چوں نیک بیاز مودش در رہ چشق　　کم حوصلہ بود از و جدائی کردم

(میں نے دل دے کر آہ و نالہ سے تعلق جوڑ لیا وار اس کی روش کی راہ میں اوروں کی بھی رہنمائی کی لیکن رہ عشق میں اس کو تھوڑا سا آزمایا تو کم حوصلہ پایا اس لیے اس سے جدائی اختیار کرلی۔)

آشفتگی دل ز بہار غم تست　　خون دل و دیدہ لالہ زار غم تست
ایں کوہ بلا را کہ تو اند برداشت　　چو نشہ مستی کہ بردباد غم تست

(تیرے غم کی بہار سے دل کی آشفتگی ہے، تیرے غم کی لالہ زاری دیدہ و دل کا خون ہے، یہ نشہ مستی تھا کہ تیرے غم کے بوجھ کو اٹھا لیا ورنہ اس بلا کو کون اٹھا سکتا تھا۔)

سرمایہ عمر و زندگانی غم تست　　بہتر از ہزار شادمانی غم تست

گفتی کہ چنیں والہ و شدات کہ کرد　　　دانی غم تو وگر ندانی غم تست

(تیرا غم ہی میری عمر اور زندگانی کا سرمایہ ہے، تیرا غم ہزاروں
شادمانیوں سے بہتر ہے، تو نے کہا کہ کون ہے جس نے تمہیں اس
درجہ دیوانہ بنا رکھا ہے خواہ تو جانے یا نہ جانے، یہ تیرا غم ہے جس
نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔)

اے دل تو دریں واقعہ دمسازی کن　　　دی جاں بموافقت سراندازی کن
اے صبر تو تاب غم نداری بگریز　　　وی عقل تو کودکی بربازی کن

(اے دل تو اس واقعہ میں رفاقت کر، اے جان تو موافقت میں سر
ڈال دے، اے صبر تو غم کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی راہ لے، اے
عقل تو ابھی طفل ہے کھیل کود میں لگ۔)

در آتش عشق جاں گدازی دگر است　　　از بہر وصال چارہ سازی دگر است
جانا تو غم ندیدۂ معذوری　　　بازی دگر است و عشق بازی دگر است

(عشق کی آگ میں جان گدازی اور چیز ہے، اور وصال کے لیے
چارہ سازی اور چیز ہے۔ میرے یار تم نے غم دیکھا ہی نہیں اس
لیے معذور ہو کھیل تماشہ اور چیز ہے، اور عشق بازی اور چیز ہے۔)

زخود مگوی ہنرہائے خویشتن ہرچند　　　کہ آنچہ باز نمائی ہزار چندانست
طعام اگر ز لذت نیو فتد بہ طعام　　　مگس چو او فتد مکروہ پاک طبعانست

(خود اپنے ہنروں کو کبھی بیان نہ کرو اس لیے کہ جتنا بھی کہوگے وہ
تھوڑا ہوگا۔ جس طرح کھانے میں مکھی کے گرنے سے کھانے کی
لذت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا لیکن پاک طبع لوگوں کی نظر میں
وہ مکروہ ہو جاتا ہے۔)

رحیم کی فارسی شاعری پست اور کم درجہ کی شاعری ہے۔ اس کے مقابلہ ہندی شاعری معیاری ہے جس میں علم و ہنر، حکمت و دانش کے موتی جڑے ہیں۔ وہ شاعری زندگی سے قریب ہے جس میں فلسفہ بھی اور شاعرانہ فنکاری بھی۔ اردو سے، ہندی شاعری کا موازنہ بے معنی ہے۔

☆☆

# تصوفانہ فکر و عمل

عبدالرحیم خانخاناں کو تصوف اور صوفیا سے بھی دل چسپی تھی۔ اس کے سوانح نگار نے اسے سلطان کے لباس میں درویش بتایا ہے۔ اس کا ہندی کلام صوفیانہ فکر کا حامل ہے اور زندگی کے تئیں اس کا رویہ اور رجحان بھی اس کے درویشی مزاج کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کی سیرت و شخصیت کے تحت ہم نے لکھا ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھا بلکہ شیعی میلانات رکھتا تھا۔ اس کی رگوں میں شیعہ باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے جدِ امجد قراقلو ترک بھی شیعی عقائد رکھتے تھے۔ شیعی مسلک تصوف کے قریب ہے۔ تمام صوفی اپنی روایات کا سلسلہ حضرت علی اور حضرت حسن بصری سے جوڑتے ہیں۔ خانخاناں کی آزادیٔ فکر، رواداری اور وسیع المشربی اسے صوفیوں اور شیعوں کے قریب کردیتی ہے۔ اس کے علاوہ ننہال کی طرف سے بھی وہ متصوفانہ روایات کا حامل تھا۔ تصوف اور صوفیا سے اس کے تعلقِ خاطر کی چند مثالیں یہاں پیش کرتے ہیں۔

خانخاناں نے مکتوبات سعدی کا مخطوطہ بڑی کوششوں سے حاصل کیا تھا۔ کیوں کہ ان میں صوفیانہ تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔ فردوسیہ سلسلہ کے مشہور صوفی حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے لکھے خطوط جو تعداد میں ایک سو تھے خاص طور پر مہیا کیے اور ان میں خصوصی دلچسپی ظاہر کی۔ ان خطوط میں تصوف کو اسلامی شریعت کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ آج بھی مسلمانوں میں یہ خطوط مقبول ہیں۔

اس سلسلہ میں عبدالقادر بدایونی کا بیان نہ صرف یہ کہ دلچسپ ہے بلکہ قابل اعتبار بھی۔ اس کی تاریخ ایک مستند ہم عصر ماخذ ہے۔ وہ بے باک قلم کار تھا۔ بادشاہ کو بھی کھری کھری سنانے سے چوکتا نہیں تھا۔ اس کی تاریخ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں چھپ نہیں سکی کیوں کہ اس پر پابندی عائد تھی۔ مُلّا چھپ چھپ کر لکھا کرتا تھا۔ جہانگیر نے ایک بار اس کے گھر کی تلاشی بھی لی تھی مگر مسودہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ بدایونی نے ریاکار صوفیا اور علما کی سخت گرفت کی ہے۔ مگر اس نے خانخاناں کی تعریف کی ہے کہ صوفیا اور بزرگوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ ایک جگہ پر خانخاناں کو تنبیہہ بھی کرتا ہے کہ بیابانی نام کے ایک مکار صوفی کے چکر میں پھنس گیا جو شعبدہ بازی کو معجزات کا نام دے کر لوگوں کو الو بناتا تھا۔

سندھ کے قیام کے دوران خانخاناں بھکّر کے مقام پر اپنے زمانہ کے مشہور صوفی قاضی عثمان کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ گھنٹوں ان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھا رہا۔ انہوں نے خانخاناں کو مرزا جانی بیگ ترکان کے خلاف فتح کا مژدہ سنایا۔ سندھ کے لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ خانخاناں کو قاضی عثمان کی وجہ سے فتح نصیب ہوئی۔ سندھ میں اور بھی بہت سے صوفیوں سے ان کا تعلق رہا۔

برہان پور کو خاندیش کے فاروقی حکمرانوں نے ۱۳۸۰ء میں آباد کیا تھا چشتی سلسلہ کے صوفی برہان الدین غریب متوفی ۱۳۴۰ء کے نام پر شہر کا نام برہان پور رکھا گیا۔ حضرت برہان الدین کا مزار خلد آباد میں ہے۔

صوفی برہان الدین کو موسیقی سے دلچسپی تھی وہ خود بھی رقص کرتے تھے۔ برہان پور دکن کا شمالی کنارہ ہے۔ دہلی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد یہاں بہت سے صوفیا آ کر بس گئے تھے۔ ان میں ٹھٹھہ کے رہنے والے صوفی بھی تھے جن میں بیشتر جولاہے تھے۔ سندھی صوفی قادریہ سلسلہ سے تعلق رکھتے

تھے۔ برہان پور میں یہ لوگ آباد ہوئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سندھ اور دکن سے خانخاناں کا کتنا گہرا تعلق رہا۔ ان علاقوں میں صوفیا کے ساتھ عبدالرحیم خانخاناں سے تعلقات تھے۔

بھکر (سندھ) میں خانخاناں کی ملاقات میر معصوم بھکری سے ہوئی۔ وہ پایہ کا بزرگ، عالم، خطاط اور مورخ تھا۔ اس نے گجرات کی مہم میں خانخاناں کی مدد کی تھی اس نے اکبر و جہانگیر کے عہد میں فتح پور سیکری کی عمارتوں کے کتبے لکھے تھے۔ خانخاناں اس پر بہت مہربان تھا۔ میر معصوم واپس بھکر آنا چاہتا تھا۔ خانخاناں نے بادشاہ سے اس کی سفارش کی اور وہ بھکر آ گیا اور خانخاناں سے ملا۔

بھکر کے مقام پر خانخاناں کی ملاقات حضرت حاجی سلطان تھانیسری سے ہوئی۔ وہ بلند پایہ عالم اور درویش تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے خسر تھے۔ اکبر نے انہیں ایک علاقہ کا کروڑی بنایا تھا مگر انہوں نے محصول دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اکبر ملحد ہے۔ انہوں نے دس سال تک کوئی محصول نہیں دیا اور تمام محصول فقرا میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ملا بدایونی کے ماتحت انہوں نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ملا نے تھانیسری کے بارے میں لکھا ہے کہ ترجمہ اتنا اصل کے مطابق ہوتا تھا کہ مسودہ پر مکھی کا میل تک ترجمہ میں آ جاتا تھا۔ اکبر کے زمانہ میں گائے کے ذبح کرنے پر پابندی عائد تھی۔ حضرت تھانیسری نے ایک گائے ذبح کر دی تھی۔ جب وہ کروڑی تھے تو ان کے خلاف ہندوؤں کی اور بہت سی شکایتیں تھیں۔ جن کی وجہ سے بادشاہ ان سے ناراض ہو گیا اور انہیں پھانسی دے دی۔ اکبر کے خلاف شیخ احمد سرہندی کی شدید نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

عبدالرحیم خانخاناں کا شیخ سلطان تھانیسری سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ بھکر میں جب خانخاناں کی ان سے ملاقات ہوئی تو وہ جلا وطنی کی زندگی گزار رہے

تھے۔ خانخاناں کی سفارش پر حاجی صاحب کو ان کی کھوئی ہوئی جاگیر واپس تو مل گئی تھی۔ مگر وہ انہیں پھانسی سے نہیں بچا سکے۔ بعد میں خانخاناں حاجی صاحب کے بیٹوں پر بھی عنایت کرتے رہے جیسا کہ امام ربانی کے خطوط سے ظاہر ہے۔ انہی خطوط سے خانخاناں کی درویش نوازی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ خطوط کی روشنی میں ہم نے خانخاناں اور شیخ احمد سرہندی کے تعلقات پر الگ باب میں روشنی ڈالی ہے۔
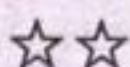
# تعمیرات

خانخاناں جب تک زندہ رہا اپنے عہد پر چھائے رہا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر اس کی شخصیت کی چھاپ نہ ہو۔ فنون لطیفہ، علم و داب، سیاست و حکومت، مذہب و سماج غرض ہر میدان میں خانخاناں کے فکر و نظر کی جلوہ سامانیاں نظر آتی ہیں۔ وہ جہاں جہاں رہا اس نے اپنی شخصیت کے نقوش چھوڑے۔ عوام کے آرام کے لئے فلاحی اور انتظامی کام کیے۔ باغ لگوائے، عمارتیں تعمیر کرائیں، سرائے بنوائیں، نئی بستیاں بسائیں، پانی کے لئے تالاب اور کنویں کھدوائے، نئی نئی عمارتیں بنوانے میں اپنے آقا مغلوں سے وہ بھی کم نہ تھا۔ اس کی بنوائی عمارتیں آج بھی اس کی یاد دلاتی ہیں۔

خانخاناں نے گجرات کی فتح کی خوشی میں ۱۵۸۴ء میں سرکھیج کے مقام پر ایک باغ بنوایا جس کا نام فتح باغ یا باغ فتح تھا۔ یہ وہی باغ تھا جس میں خانخاناں نے جہانگیر کی دعوت کی تھی اور اس کی بیٹی نے باغ کو مصنوعی پھولوں سے سجایا تھا۔ سابرمتی کے کنارے پر بنا یہ باغ اس عہد میں ایک عظیم الشان تفریح گاہ بن گیا تھا۔ جو بھی سیاح گجرات آتا اس باغ کی سیر ضرور کرتا اور وہاں سے باغ کی تعریف کرتا ہوا لوٹتا۔ احمد آباد کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ وہاں کے لوگوں کے لیے پکنک اسپاٹ تھا۔ باغ پچاس ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا تھا اور جس کے چاروں طرف چہار دیواری تھی اور آرام کے لیے بہت سی عمارتیں بنوائی گئی تھیں۔ دنیا کے کونے کونے سے طرح طرح کے پھولوں کے پودے اور پیڑ لا کر یہاں لگائے گئے

تھے۔ جہانگیر دوسری بار جب گجرات گیا تب بھی اس باغ کو دیکھنے گیا اور تزک میں خاص طور پر باغ کی تعریف لکھی۔ سیر کے دوران اس نے بہت سے پھلوں کو اپنے ہاتھوں سے توڑا۔ اس نے ایک انجیر توڑا جس کا وزن ساڑھے سات تولہ تھا اور اتنا بڑا انجیر اور کہیں پیدا نہیں ہوتا تھا۔

یورپی سیاحوں نے فتح باغ کی سیر کی اور اپنے سفرناموں میں اس کی خوبصورتی کو بیان کیا۔ کئی صدیوں تک یہ باغ لوگوں کے لیے دلکشی کا باعث بنا رہا۔ لیکن افسوس اٹھارہویں صدی میں مراٹھوں کی شورشوں کی وجہ سے یہ باغ تباہ و برباد ہوگیا اور ڈاکوؤں کی پناہ گاہ بن گیا۔ بہت سے جاگیرداروں نے اس کی زمین پر قبضہ کرلیا اور وہاں کھیتی باڑی ہونے لگی۔

خانخاناں نے اپنی صوبیداری کے زمانہ میں برہان پور میں بہت سی اصلاحیں نافذ کیں۔ برہان پور میں پانی کی قلت رہتی تھی اور لوگوں کی یہ عام شکایت تھی۔ خانخاناں نے آب رسانی کا جدید نظام قائم کیا۔ شہر کے وسط میں ایک وسیع حوض بنوایا جس میں آس پاس کی پہاڑیوں سے پانی حوض تک پہنچایا گیا۔ یہاں سے پانی چھوٹی چھوٹی نالیوں اور پائپوں کے ذریعہ گھروں تک سپلائی کیا جاتا تھا۔ (زمیں دوز نہر اگلے باب کا ملاحظہ کریں)

برہان پور میں خانخاناں نے ایک باغ بھی لگوایا جس کا نام لال باغ تھا۔ اس باغ کے بیچ میں بھی ایک تالاب بنوایا جو چالیس مربع گز پر پھیلا ہوا تھا۔ ہوا خوری کے لیے تالاب کے درمیان ایک عمارت بنوائی جس میں دالان و برآمدے تھے۔ عمارت تک پہنچنے کے لیے تالاب کے اندر سے چار راہداریاں تھیں جن کے گرد طرح طرح کے درخت اور پھول پودے لگائے گئے تھے۔ ایک ایسے نیلوفر پھول کی بیل بھی یہاں لگائی گئی جو اپنی خوشبو اور خوبصورتی میں لاثانی تھا۔

برہان پور کی جامع مسجد کی تعمیر نو کرائی۔ خاندیش کے صوبیدار راجہ علی خاں نے یہ مسجد تعمیر کرائی تھی جو ایک سادہ سی عمارت تھی۔ خانخاناں نے اس میں

مزید اضافہ کیا۔ برہان پور میں اپنی رہائش کے لئے ایک محل بھی تعمیر کرایا۔

خانخاناں نے اپنی حیات ہی میں اپنی بیوی کی قبر پر مقبرہ تعمیر کرایا تھا جس میں وہ خود بھی مدفون ہے۔ خانخاناں کا مقبرہ مغل فن تعمیر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساٹھ سال پہلے ہمایوں کا مقبرہ تعمیر ہوا تھا جس میں ایرانی و بازنطینی فن تعمیر غالب تھا۔ فن تعمیر کے ان دونوں نمونوں کے بیچ بہت سی مغل عمارتیں وجود میں آئیں جن میں سکندرہ میں واقع اکبر کا مقبرہ اور لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ برخلاف مقبرہ ہمایوں کے ان دونوں عمارتوں میں مقامی یا ہندوستانی فن تعمیر کی خصوصیات نمایاں ہیں چونکہ ان کے زیادہ تر کاریگر ہندوستانی تھے اور وہ سب آقاؤں کے تصورات کو پوری طرح پتھر اور چونے میں ڈھالنے میں قاصر تھے۔ اس لیے انہوں نے بہت کچھ اپنے خیال سے شامل کر دیا جس کی وجہ سے انڈو ایرانی فن تعمیر وجود میں آیا۔ خانخاناں کے مقبرہ میں پھر سے خالص ایرانی فن تعمیر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ہمایوں کے مقبرہ کی نقل نظر آتا ہے مگر بہت کچھ مختلف بھی ہے۔ یہ زیادہ سادہ ہے۔ ہمایوں کا مقبرہ ہشت پہلو ہے جب کہ یہ چوکور ہے۔ ایک بلند چبوترہ جس کے چاروں طرف سترہ سترہ دروازوں کی شکلیں، دوہرا گنبد، بلند دروازے اور محرابیں، ہمایوں کے مقبرہ کی طرح ہیں۔ یہی فن تعمیر بعد میں اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ تاج محل میں دہرایا گیا ہے۔ افسوس کہ اٹھارہویں صدی میں آصف الدولہ کے زمانہ میں خانخاناں کے مقبرہ کا سنگ مرمر اور سنگ سرخ چرا لیا گیا اور کچھ صفدر جنگ کے مقبرہ میں استعمال کر لیا گیا۔

اپنے چہیتے اور وفادار غلام میاں فہیم کا مقبرہ بھی خانخاناں نے تعمیر کرایا تھا اس کے بارے میں آثار الصنادید میں لکھا ہے:

> ”ہمایوں کے مقبرہ کے پاس ہے۔ کوئی تو اس کو حجام کا مقبرہ بتاتا ہے اور کوئی فہیم کا۔ پہلی بات تو یقیناً غلط ہے۔ دوسری بات اگر صحیح

ہو تو یہ مقبرہ عبدالرحیم خانخاناں کا بنوایا ہوا ہے۔ ۱۰۳۳ھ مطابق ۱۶۲۳ء میں جب کہ مہابت خاں نے خانخاناں کو براہ دغا نظر بند کیا تو پہلے فہیم کے پاس جو خانخاناں کے بڑے عزیز چیلوں میں سے تھا پیغام سفارش بھیجا۔ اس نے نہ مانا اور اپنے بیٹے اور چالیس رفیقوں کے ساتھ لڑ کر مارا گیا۔ غالب ہے کہ جب خانخاناں بیس جلوس جہانگیری مطابق ۱۰۳۴ھ موافق ۱۶۲۴ء کے زمانہ میں اس نے یہ مقبرہ بنوایا۔ یہ مقبرہ بالکل چینی کاری ہے اور خوش رنگ اور خوبصورت چینی کاری اور رنگ آمیزی کی ہوئی ہے کہ دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے۔ برج اس مقبرہ کا بالکل نیلے رنگ کا ہے اور اسی وجہ سے نیلہ برج کے نام سے مشہور ہے۔"

لاہور میں خانخاناں نے ایک سرائے بھی تعمیر کرائی تھی۔ اس سرائے کا حال غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں میں بھی ملتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سرائے کے طرز پر حماموں کو بھی رواج دیا۔ حمام ہندوستان کے لیے بالکل نیا تصور تھا۔ خانخاناں نے حماموں کو شہری منصوبہ بندی کے ایک پہلو کے طور پر اپنایا اور ایسے حمام بھی بنوائے جو صرف عوام کے لیے تھے۔

سمندر پر پرتگالیوں کا قبضہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو سمندری سفر میں دشواریاں پیش آتی تھیں۔ خانخاناں نے اپنے ذاتی خرچ سے تین جہاز بنوائے جن کے نام رحیمی، کریمی اور سالاری رکھے گئے مسلمان عام طور پر ان جہازوں میں حج کے لیے جاتے تھے۔

☆☆

# زمیں دوز نہر

تاپتی ندی کے کنارے اور ضلع کھنڈوہ میں واقع برہان پور میں رحیم کی تعمیر کردہ زمین دوز نہر کے جو آثار دریافت ہوئے ہیں وہ مغل عہد کی انجینئرنگ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ حال ہی میں انڈین ہیریج سوسائٹی (Indian Haritage Society) کے تحت ماہرین کی ایک ٹیم جدید آب رسانی کے اس نظام کو دیکھنے برہان پور گئی تھی۔ اپنے مشاہدہ اور مطالعہ کے بعد اس ٹیم نے ۱۹۹۳ میں اپنی رپورٹ پیش کی جس سے کچھ اہم اقتباسات جن کا تعلق اس کتاب سے ہے۔ یہاں پیش کیے جاتے ہیں باقی رپورٹ تکنیکی نوعیت کی حامل ہے:

عہد جہانگیری میں جب عبدالرحیم خانخاناں صوبہ خاندیش کا صوبیدار تھا تو اس نے اس کے دارالخلافہ برہان پور کے مضافات (ست پڑا پہاڑ) میں ۱۶۱۵ء میں ایک زمین دوز نہر تعمیر کرائی تھی تاکہ پانی کی کمی کو پورا کیا جاسکے۔ یہ نہر خانخاناں نے ذاتی پیسہ سے تعمیر کرائی تھی۔ اس زمانہ میں طبقات الارض (Dept of Earth) ہوتا تھا جس کے توسط سے یہ کارنامہ انجام پایا۔ تعمیر کے بعد اس کا انتظام محکمہ اوقاف کے سپرد کردیا گیا جو اس زمانہ میں اس طرح کے خیراتی کاموں کو انجام دیتا تھا۔ کتبہ (جو یہاں سے برآمد ہوا ہے، جس پر عبدالرحیم خانخاناں کا نام کندہ ہے۔) میں تحریر ہے۔ ''یہ نہر بلا امتیاز و رکاوٹ عوام کے فائدے کے لیے ہے اور آنے والی نسلوں کے فائدے کے لیے۔'' اس نہر سے جن نالیوں کے ذریعہ پانی شہر تک پہنچایا جاتا تھا وہ مسجدوں، حماموں، سرایوں وغیرہ کو سیراب کرتا تھا۔

کسی بھی شہر میں آب رسانی کی ایسی نہر نہیں ہے۔ جب سے یہ نہر تعمیر ہوئی کئی دفعہ اس کو نقصان پہنچا۔ اولاً نویں صدی کے آخر میں جب انگریزوں نے اس کی مرمت کی جنہوں نے بجائے اسے صاف کرنے کے اس کی کچھ نالیوں کو بند کردیا، کچھ نالیوں کو بند کر کے ان کی جگہ لوہے کے پائپ لگا دیے۔ یہ مرمت آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ کچھ سال پہلے اس نہر میں بہت زیادہ کوڑا جمع ہونے سے اس کے بعض حصے ناکارہ ہوگئے تھے۔ اس نہر کو جنگلات کے کٹنے سے بھی نقصان پہنچا۔ اس نہر کے تین حصے ہیں۔ (۱) سوکھا بھنڈار۔ (۲) مول بھنڈار۔ (۳) چنتا ہرن۔

نہر کی گہرائی زمین سے اسی سے سو فٹ ہے۔ ان تینوں نہروں کا پانی لال باغ کے قریب اس جگہ کے آس پاس اکٹھا ہوتا تھا جہاں اب تاپتی مِل ہے وہاں پر ۲۴ فٹ گہرا اور پچاس فٹ مربع حوض تھا جس میں پانی فلٹر ہوتا تھا۔ سوکھا بھنڈار کی شکل کنویں جیسی ہے۔ اندر اترنے کے لیے گیارہ سیڑھیاں ہیں۔ کافی اندھیرا رہتا ہے۔ دیواروں میں بنے چشموں سے پانی رستا رہتا ہے اور جمع ہو کر شہر کی طرف بہتا ہے۔ نہر میں مینارے جیسے کھمبے ہیں جن سے روشنی کا انتظام کیا گیا ہے۔ نہر کی لمبائی تقریباً تیرہ ہزار فٹ ہے اس کے بعد جو حصہ مٹی کے نلوں سے جوڑا گیا ہے وہ الگ ہے۔ دوسری نہر مول بھنڈار اندر دھنس گئی اور اب اس کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہا۔ تیسری نہر چنتا ہرن ہے۔ اس میں بھی پانی جمع ہو کر شہر کے گھروں میں جاتا تھا۔

اس نہر کی پانی پہنچانے والی نالیاں اگرچہ بند ہوگئی ہیں مگر پھر بھی صاف کر کے انہیں دوبارہ جاری کیا جا سکتا ہے۔ اس کے اندر بنی گنڈیاں (مینارنما کنویں) آج بھی لوگ کنوؤں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ ایک ہی حصے یعنی سوکھا بھنڈار سے ان نہروں کا معائنہ و مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جو اپنی صحیح حالت میں ہے اور جنہیں آج بھی لوگ دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ یہ زمین دوز نہری نظام نہ

صرف پورے ہندستان میں بلکہ پوری دنیا میں منفرد ہے۔

عبدالباقی نہوندی برہان پور میں ہی خانخاناں سے آکر ملا تھا۔ اس نے ان تعمیرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ وہ اپنی کتاب میں اس نہر اور دوسری عمارتوں کا ذکر کرتا ہے:

''لال باغ سے جامع مسجد کے دروازے تک جو اس شہر کا مرکز ہے ممتاز فنکاروں و معماروں کو مقرر کیا تھا کہ وہ پتھر، چونے و گچ سے اس نہر کے دہانے اور نالیوں کو پختہ کردیں جنہوں نے شہر کی طرح یہ نہر بھی پختہ بنائی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر فرہاد زندہ وہتا تو اس بات کا اعتراف کرتا کہ یہ نہر جوئے شیر کو مات کرنے والی ہے۔ نہر کے علاوہ مسجد کے احاطے میں ایک سنگین حوض اور حجرے تعمیر کرائے۔''

مولانا فریدالدین جو خانخاناں کے دربار کے ملازم تھے۔ علم جفر ونجوم حساب وغیرہ میں کمال رکھتے تھے، قطعۂ تاریخ لکھنے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ آخری شعر سے نہر کے مکمل ہونے کی تاریخ اور اس کا تاریخی نام ''خیر جاری'' بھی نکلتا ہے۔ اس نظم کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

دنیا کا نامور سپہ سالار خانخاناں جو بارگاہ سلطنت کا ستون ہے
اس کا دست سخاوت دریائے سوال کا پُل ہے اور اس کے ہاتھ کی
نمی ابر بہار کی طرح فیض رساں ہے۔
اس نے شہر کے اندر ایسی نہر جاری کی جس سے اہل بازار اور
مکان والے، ہر خاص و عام بھی سیراب ہوتے ہیں۔
جہانگیر بادشاہ کے دور سلطنت میں جس کے سر پر تاج شاہی ناز

کرتا ہے۔

اس نہر کا کام انجام کو پہنچا، خدا کرے اس چشمہ کا فیض بند نہ ہو۔

اپنے بانی کی پائیدار حکومت کی طرح جب تک دنیا کا نظام قائم ہے۔ یہ نہر بھی جاری رہے۔

دل دانا نے جب اس نہر کی تاریخ تعمیر پوچھی تو ہاتف غیبی نے برجستہ جواب دیا کہ ''خیر جاری'' ۱۰۲۴ھ (مطابق ۱۶۱۵ عیسوی)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خانخاناں کے مقبرہ کے چبوترے پر پشت کی جانب ایک فوارہ ہے جس سے دو حوض دو نالیوں سے جڑے ہیں۔ اتنی بلندی پر ان حوضوں میں فوارے کے لیے پانی کس طرح لایا جاتا تھا۔ یہ بھی معمّہ ہے۔ یہ فوارہ ہمیں برہان پور کی اس عجوبۂ روزگار نہر کی یاد دلاتا ہے۔

☆☆
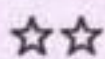
# خانخاناں اور شیخ احمد سرہندی

شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی اپنے زمانہ کے جید عالم اور صوفی تھے۔ ان کے مذہبی افکار سے کئی نسلیں متاثر ہوئیں بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہندوستان میں اسلامی احیا پرستی اور بنیاد پرستی کے اولین معمار وہی ہیں۔ آئندہ بہت سی تنظیموں اور شخصیتوں نے خام مواد شیخ احمد سرہندی سے حاصل کیا ہے۔ انہوں نے اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے خطوط کو ذریعہ بنایا۔ یہ خطوط انہوں نے اپنے مریدوں، امرا اور شہزادوں کو لکھے جو اکبری عہد کے افکار کے خلاف ردعمل کے طور پر لکھے گئے تھے۔ ان خطوط نے مہم اور تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی اور مشترکہ تہذیب کے عمل پر جو اس عہد میں اپنے عروج پر تھا روک لگا دی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام پر ہندو اور شیعی عناصر نے جو بدعت ہیں، غلبہ کرلیا۔ اسلام کو ان عناصر سے پاک رکنا چاہیے۔ وہ اسلام میں تمام فرقوں کو باطل قرار دیتے تھے اور صرف حنفی مسلک کے پیرو کار سنت و الجماعت کو حق پر سمجھتے تھے ان کے نزدیک صرف یہی واحد فرقہ ناجی ہے یعنی جنتی۔ انہوں نے نظریہ وحدت الوجود کو رد کیا اور اس کی جگہ وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ وہ حضرت باقی باللہ سے بیعت تھے اور ان کے نظریات کے زبردست مبلغ بن گئے تھے۔ انہوں نے 'ردِ روافض' کے نام سے شیعوں کے خلاف کتاب بھی لکھی۔

کہا جاتا ہے کہ فوج میں ان کا کافی اثر تھا۔ اس زمانہ کی ایک ممتاز شخصیت شیخ فرید بخاری مرتضیٰ خاں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ شیخ فرید

بادشاہ گر مشہور تھے۔ غیر جانب دار امرا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جہانگیر کی تخت نشینی ان ہی کی رہین منت تھی جس کا ذکر ہو چکا ہے وہ میر بخشی کے (پے ماسٹر) کے بلند عہدہ پر فائز تھے۔ شیخ فرید کے نام شیخ سرہندی نے خطوط لکھے۔ مجدد الف ثانی کا کہنا تھا کہ پہلے امرا اور فوجی افسروں کو اپنا ہمنوا بنایا جائے۔ ان کے ماتحت لوگ خود بخود ان کی روش اختیار کریں گے۔

اسی مقصد سے انہوں نے خانخاناں کو بھی خطوط لکھے۔ ان خطوں سے نہ صرف یہ کہ دونوں کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ شیخ کا نظریہ اور طریقہ کار سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ خانخاناں نے بھی شیخ کو خطوط لکھے مگر افسوس کہ یہ خطوط دستیاب نہیں۔ حضرت شیخ احمد نے خانخاناں کو ایک درجن کے قریب خطوط لکھے ان خطوں میں خانخاناں کی تعریف ملتی ہے۔ اسے تنبیہہ و تاکید بھی کرتے ہیں۔ ضرورت مندوں کے لیے سفارش بھی کرتے ہیں۔ بیشتر خطوط میں اپنے نظریات کی تبلیغ ہی نظر آتی ہے۔ ایک خط کے سرنامہ پر ایک شعر لکھتے ہیں جس کا مطلب ہے۔

> ''تبلیغ کی شرط کے تحت میں نے جو کچھ کہہ دیا ہے۔ باقی آپ جانیں اس سے نصیحت حاصل کریں یا رنج و ملال۔''

اسی خط میں لکھتے ہیں:

> یہ ٹھیک ہے آپ نے فقرا کی خدمت بہت کی ہے لیکن ساتھ ہی فقرا کا لحاظ بھی ضروری ہے تاکہ اس سے ثمرہ اور نتیجہ برآمد اور اس کے بغیر تو خار دار درخت پر ہاتھ پھیرنے والی بات ہے یعنی کوئی فائدہ نہیں۔'' حضرت شیخ ایک دوسرے خط میں رقم طراز ہیں چونکہ آپ نے فقرا کے آداب کا لحاظ رکھا ہے اور باتوں میں تواضع اختیار کی ہے۔ اس کے مطابق مَن تواضع لِلّٰہِ رَفعہٗ

اللہ (حدیث) یعنی جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اسے بلندی عطا کرتا ہے۔ امید ہے کہ آپ کا یہ عجز وتواضع آپ کے دینی و دنیوی رفعت کا سبب بنے، بلکہ بن چکا ہے۔ آپ کو بشارت ہو، چونکہ آپ درمیان میں رجوع اور انابت کے الفاظ لے آئے ہیں اس لیے یوں تصور کریں کہ آپ کا یہ رجوع درویشوں میں سے کسی درویش کے ہاتھ پر واقع ہو چکا ہے۔ لہذا اچھے ثمرات و نتائج کے منتظر ہیں۔ لیکن حتی الامکان درویشوں کے حقوق و آداب کا لحاظ رکھیں۔"

اسی خط میں نہایت شدت اور جوش کے ساتھ اپنے نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں:

"مختصر یہ کہ نجات کا راستہ اہل سنت و جماعت کی متابعت ہے (اللہ تعالیٰ اس گروہ کو اور زیادہ کرے) اقوال میں بھی، افعال میں بھی اور احوال و فروع میں بھی کیونکہ نجات والا فرقہ صرف یہی ہے۔ باقی تمام فرقے زاول اور ہلاکت کے کنارے کھڑے ہیں۔ آج کسی کے علم میں یہ بات آئے یا نہ آئے لیکن کل (قیامت) کو ہر ایک جان لے گا مگر اس وقت جاننا بے سود ہوگا۔" 21؎

عبدالرحیم خانخاناں کے ایک دستی خط کے جواب میں حضرت مجدد الف ثانی ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔ خط ختم کرنے کے بعد پس نوشت کے طور پر لکھتے ہیں:

جو برادر سعادت یہ خط لے کر آیا تھا اس نے بتایا کہ اس کے ساتھیوں میں اک شاعر ہے جو کفری تخلص کرتا ہے۔ اس پر تبصرہ

کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ شاعر سادات عظام اور نقبائے کرام میں سے ہے۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ اسے بین الشناتم برے اسم پر کس چیز نے برانگیختہ کیا۔ مسلمانوں کے لیے مناسب ہے کہ اس برے نام سے شیر سے بھی زیادہ بھاگے اور اس سے پوری طرح نفرت و کراہت کرے کیوں کہ یہ اسم اور اس کا مسمّٰی دونوں اللہ اور اس کے رسول کے ہاں ناپسندیدہ و مبغوض ہیں۔ مسلمانوں کو تو حکم ہے کہ اہل کفر سے عداوت رکھیں اور ان پر سختی رکھیں۔ لہذا ایسے برے اسم سے احتراز و پرہیز ضروری اور واجب ہے۔ اور بعض مشائخ قدس اللہ تعالی اسرارہم کی عبادات میں غلبہ سکر میں جو کفر کی مدح اور زنار وغیرہ باندھنے کی ترغیب واقع ہوئی ہے۔ اس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں اور ان کی تاویل کی گئی ہے کیونکہ متون (؟) کا کلام ٹھیک معنی پر محمول کیا جاتا ہے اور ظاہری اور قریب الفہم معنی پر محمول نہیں کیا جاتا۔''

خانخاناں کے نام ایک اور خط سے حضرت شیخ کے نظریہ اور طرز فکر پر روشنی پڑتی ہے وہ لکھتے ہیں:

''اگر پوچھیں صفات (نیکیوں) میں اجر کئی گنا ہے اور برائیوں میں ان کے مثل (برابر) جزا ہے تو پھر کفار کو چند روزہ برائیوں کے عوض ہمیشہ کا عذاب کیوں ہوگا؟ میں کہتا ہوں عمل کے لیے جزا کا ہم مثل ہونا واجب اللہ تعالیٰ کے علم پر موقوف ہے جس کے سمجھنے سے ممکن کا علم قاصر ہے۔ (نیکیوں کا کئی گنا اجر اللہ کے علم میں کیوں موقوف نہیں)

مثلاً قذف محصنات یعنی نیک بیاہی عورتوں کو زنا کی تہمت لگانے
میں اس کے ہم مثل جزا اسی کوڑے فرمائی ہے اور چور کی حد میں
چور کا دایاں ہاتھ کاٹ ڈالنا اس کی جزا ہے۔ اور زنا کی حد میں
کنوارے کا کنواری کے ساتھ زنا کی صورت میں سو کوڑے یا ایک
سال جلا وطن مقرر کی ہے۔ اور شادی شدہ آدمی کا شادی شدہ
عورت کے ساتھ زنا کی صورت میں رجم یعنی سنگساری کرنے کا حکم
فرمایا ہے۔ ان حدود اور تقدیرات کا علم انسان کی طاقت سے
خارج ہے۔
ذالک تقدیر العزیز العلیم یعنی یہ خدائے عزیز و علیم کا اندازہ
ہے۔ پس کفار کے بارے میں حق تعالیٰ نے کفر موقت کے موافق
ہمیشہ کا عذاب فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ کفر موقت کی ہم مثل جزا
بھی ہمیشہ کا عذاب ہے اور وہ شخص جو تمام احکام شرعیہ کو اپنی عقل
کے مطابق کرنا چاہے اور عقل و دلائل کے برابر کرنا چاہے وہ شان
نبوت کا منکر ہے۔ اس کے ساتھ کلام کرنا بے وقوفی ہے۔'' (واہ کیا
خوب!)

یہاں حضرت شیخ نے غور و فکر کے تمام دروازے بند کر دیے۔ ایک بہت
اہم سوال تھا کہ ایک نیکی کے عوض دس گنا ثواب ہے جب کہ ایک برائی کے عوض
اسی قدر عذاب ملے گا۔ کافر کے گناہوں کی سزا بھی اسی حساب سے ہونی چاہیے۔
اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑا منصف بتایا گیا ہے اور اسلام کی سب سے بڑی اساس
عدل ہے۔ پھر یہ دھاندلی کیوں؟ حضرت شیخ سے جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو
بات کو تاویلوں کی بھول بھلیوں میں الجھا کر ختم کر دیا۔ (تاویل و تعبیر نے مسلمانوں

کو برباد کردیا)

شیخ احمد سرہندی کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ ادیب تھے۔ ان کی نثر میں مولانا آزاد کی سی خطابت ہے۔وہ اپنی تحریر کو مولانا کی طرح عربی اور فارسی شعروں سے مزیّن کرتے ہیں۔ احادیث اور قرآن سے بے ساختہ حوالے نقل کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان نہایت موثر ہے۔ سفارش کرتے ہیں یا مراعات طلب کرتے ہیں تو نہایت حسین پیرایہ میں ۔ ایک عزیز کی سفارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سیادت پناہ! حقائق و معارف آگاہ! میرے بھائی اور میرے عزیز میر محمد نعمان کا وجود شریف آپ کے علاقہ میں بہت غنیمت ہے اور انکی دعا اور توجہ کبریت احمد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی دولت کی پختگی اور پائیداری انہی کی توجہات کے فیوض و برکات سے ہے۔ اور میں غائب اور حاضر میں ان کو آپ کا ممد و معاون پاتا ہوں۔ ایک سال سے زیادہ ہوگیا کہ انہوں نے آپ کی خوبیاں غائبانہ طور پر اس فقیر کو لکھ بھیجی تھیں اور جو آپ کو اس فقیر کی نسبت محبت و اخلاص ہے وہ بھی درج کیا تھا اور یہ اظہار کیا تھا کہ اس علاقہ کی صوبیداری کسی اور کے سپرد کر رہے ہیں ۔ یہ وقت توجہ اور دستگیری کا ہے۔ فقیر کو اس خط کے مطالعہ کے دوران میں اس متعلق توجہ حاصل ہوئی تو اس وقت آپ کا بہت بلند مرتبہ دیکھا (اسی لیے میں نے ایک خط میں) یہ عبارت لکھی کہ مجھے خانخاناں بہت بلند مرتبہ نظر آتے ہیں اور معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔''

اور اسی خط میں تمہید باندھتے ہیں وہ یہ ہے کہ

''اکثر دولت مند لوگ اس وقت درویش کے لیے محتاجی کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ انسان اپنی ذات میں محتاج ہے بلکہ تمام کائنات فطرتاً محتاج ہے۔ بلکہ انسان کی خوبی ہی اس محتاجی میں ہے اور اس کی بندگی اور مسکینی اسی راہ سے پیدا ہوتی ہے۔ فرض کرو اگر محتاجی انسان سے زائل ہوجائے اور استغنا آجائے تو سوائے گناہ اور سرکشی اور طغیانی اور نافرمانی اور کیا چیز اس کو حاصل ہوگی۔''

ایک اور خط میں سفارش کا دلکش انداز ملاحظہ فرمایئے

''دو ضروری اور اہم کام بے اختیار آپ کو تکلیف دینے کا باعث بنے ہیں۔ ایک رنج و آزار کا گمان رفع کرنے کا اظہار، بلکہ آپ سے دوستی اور اخلاص کا ہونا اور دوسرا ایک محتاج آدمی کی محتاجی کی طرف اشارہ جو فضیلت اور نیکی سے آراستہ ہے اور معرفت و شہود سے مزیّن ہے جو نسب کے لحاظ سے کریم اور حسب کے اعتبار سے شریف ہے۔''

سفارش کا ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمالیجئے

''باقی مطلب یہ ہے کہ حامل رقعہ میاں شیخ احمد مغفرت پناہ شیخ سلطان تھانیسری 21 کا بیٹا ہے۔ آپ کی مہربانیوں اور احسانوں کو یاد کر کے جو آپ نے اس کے والد بزرگوار کی بہ نسبت کیے تھے۔ اس فقیر کو وسیلہ بنا کر آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوتا ہے اور آپ کی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی یہ تھی کہ ایک موضع جو

''پرگنہ اندری میں انعام فرمایا جائے۔ آگے آپ کا اختیار ہے بلکہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔''

حضرت شیخ نے خانخاناں کی تعریف میں اپنی انشا پردازی کے جوہر دکائے ہیں۔ خانخاناں کا ایک خط ایک صاحب شیخ کے پاس لے کر حاضر ہوتے ہیں اس خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

'باسعادت و باصداقت برادر نے تمہارا خط پہنچایا اور زبان ترجمان سے تمہاری جناب کا حال بیان کیا تو میں نے یہ شعر پڑھا

اهلا لسعدیٰ والرسول و حبّذا وجه الرسول محب وجد المرسل

(اے سعدیٰ (معشوقہ) اور اے اس کے قاصد! تم اپنے اہل میں تشریف لائے اور تمہاری طرف سے آنے والے قاصد کا چہرا کس قدر حسین ہے کیونکہ روانہ کرنے والے کا چہرہ بڑا محبوب ہے۔

ان خطوط کی روشنی میں اگر ہم خانخاناں کی شخصیت کو دیکھتے ہیں تو وہ بہت بلند پایہ انسان نظر آتے ہیں۔ انداز بیان دیکھئے بلیغ پیرایہ ہے۔ خیالات میں گہرائی اور گیرائی ہے۔ قاری کے ذہن پر یہ تحریریں اپنا اثر چھوڑے بنا نہیں رہ سکتی ہیں۔ ان کے بعض نظریات سے اختلاف کیا جاتا ہے مگر ان کی عظمت سے انکار ممکن نہیں وہ اپنے عہد پر چھائے رہے۔ دانشوروں کی صف میں اول درجہ رکھتے ہیں۔ یہ بلا وجہ ہی نہیں کہ انہوں نے آنے والی بیشمار نسلوں کو متاثر کیا ہے اور آج بھی ان کی فکر کا جادو چل رہا ہے۔ سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے وحدۃ الوجود کے رد میں وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا جو آج پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لیے ہے۔ یہ بھی غور طلب ہے کہ حضرت شیخ نے یہ خطوط اس دور میں لکھے ہیں جب مسلمانوں کا اقتدار اپنے عروجِ پر تھا۔

☆☆

# رحیم کی ہندی شاعری

## پس منظر

عبدالرحیم خانخاناں سے تقریباً چھ سو سال پیشتر ہندی زبان کے ارتقا کا عمل شروع ہوا تھا اور اس کے عہد تک آتے آتے اس زبان نے ادبی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ گو علاقوں کے اعتبار سے یہ مختلف شکلوں میں رائج تھی۔ کہیں یہ برج بھاشا و کھڑی بولی کے نام سے جانی جاتی تھی تو کہیں اس کا نام اودھی و بھوجپوری تھا۔ کہیں راجستھانی و گجراتی تھی تو کہیں بندیلی۔ لیکن اصل میں ایک ہی زبان تھی جو ہندی یا ہندوی اصل میں ایک ہی زبان تھی جو بعد میں اردو کہلائی۔ نئی تحقیقات کے مطابق حضرت امیر خسرو سے بھی دو سو سال پہلے ہندی زبان رائج تھی اور اس میں شاعری ہو رہی تھی۔ یہی زمانہ ہے جب شورسینی اپ بھرنش ہندی کا روپ اختیار کر رہی ہے ایک ہزار عیسوی قبل گورکھ ناتھ نام کا ایک سنت ہوا ہے جو ہندی میں شاعری کرتا تھا۔ اس کے نام پر گورکھ ناتھ پنتھی ایک فرقہ وجود میں آیا جس کے ماننے والے شاعری کے ذریعہ اپنی تعلیمات کا پرچار کرتے تھے۔ ناتھ پنتھیوں کو بھکتی تحریک کا پیشرو سمجھنا چاہئے کیوں کہ ان دونوں کا پیغام ایک ہی ہے۔ یہ لوگ پورے ہندوستان میں شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ ناتھ پنتھیوں کی شاعری کے نمونے بھی دستیاب ہو گئے ہیں۔(امرت رائے)

گیارہویں اور بارہویں صدی میں بھی ہندی زبان میں شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ مسعود سعد ابن سلمان (۱۱۳۰ - ۱۱۷۴) کے بارے میں حضرت امیر خسرو نے لکھا ہے کہ وہ ہندی کا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کے بعد بہت سے صوفی شعرا ہوئے ہیں جو ہندی میں شاعری کر رہے تھے جن میں حضرت بابا فرید (۱۱۷۳ - ۱۲۶۷) شیخ شرف الدین بوعلی قلندر (۱۳۲۳ وفات) حضرت حمیدالدین ناگوری (۱۱۸۳ - ۱۲۷۴) اور حضرت یحییٰ منیری (۱۳۷۰ وفات) مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ فہرست کافی طویل ہوسکتی ہے۔ ان سب صوفیا کی شاعری کے نمونے بھی کتابوں میں ملتے ہیں۔

تیرہویں صدی کے آغاز میں حضرت امیر خسرو (۱۲۳۶ - ۱۳۲۴) منظر عام پر آتے ہیں جن کا ہندوی کلام آج بھی قوالوں کی زبان پر ہے ان کی مثنویوں میں بے شمار ہندی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ وہ اس بات پر فخر کرتے تھے:

چوں من طوطی ہندم از راست پرسی
زبان ہندوی پرس تا نغز میگویم

-------

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری، ندارم کز عرب گویم سخن

امیر خسرو کے نام سے بہت سے دوہے بھی منسوب کیے جاتے ہیں مثال کے طور پر ایک دوہا ملاحظہ کریں۔

اعجاز خسروری کا ایک دوہا ہے۔

خسرو دین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو، من پیوکو دوبھئے ایک رنگ

ابری بارد و من می شوم از یار جدا
چوں کنم دل بہ چنین وقت ز دل دار جدا

امیر خسرو کی مثنوی سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''اگر میں عقل و انصاف سے ہندوی زبان کے اوصاف بیان کروں تو ناظرین معترض ہوں گے اور اگر میں اپنے قول کی تائید میں قسم کھاؤں تو نہیں معلوم کہ اس کا یقین کیا جائے گا یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میری ہندوی زبان کا علم بالمقابلہ سمندر کے قطرے کا رکھتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے جس شخص نے ہندوستان اور دریائے گنگ کو نہ دیکھا ہو وہ ہندوستان کے طوطی کی کیا قدر کرے گا جو خراسانی پیر ہندوستانی کو احمق سمجھتا ہو وہ غالباً ملک کے پان کو گھاس سمجھتا ہوگا۔ میرے اس قول کو وہی منصف طبع لوگ باور کریں گے جنھوں نے مختلف ممالک میں سیاحت کی ہے اور غور وخوض کے ساتھ ان ممالک کا مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن جو شخص تعصب سے کام لے گا وہ البتہ غیر ملکی انجینئروں کو ہندوستان کے آموں پر ترجیح دے گا مگر ہندوستان نہ صرف وسیع ترین ملک ہے بلکہ جنت نشان ہے کیوں کہ اس ملک کو جنت سے کوئی مناسبت نہ ہوتی تو حضرت آدم اور طاؤس اس ملک کی زینت نہ ہوتے۔ ہندوی زبان کا عربی سے تو مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ مگر وہ فارسی سے کم نہیں ہے۔''

محمد مجیب نے اپنی کتاب Indian Muslims میں امیر خسرو کے عہد کے حوالے سے لکھا ہے:

''چودھویں صدی کے خاتمے تک ہندو دھرم اور فلسفہ نے مسلم ذہن پر تو کم اثر ڈالا۔ لیکن ہندی گیتوں میں جو بھگتی رس تھا اور اس زبان میں جو کشش تھی اس نے صوفیوں پر بہت اثر کیا جس کی بدولت ہندو مسلم اتنے قریب آئے کہ کوئی دوسرا اثر انہیں اتنا قریب نہ کرسکتا تھا۔ سیرالاولیاء اور جامع الکلام میں ایسے تمام واقعات درج ہیں کہ ہندی گیتوں نے کس طرح جذب کی کیفیت پیدا کردی۔ شیخ نظام الدین اولیاء کو الفاظ کی موسیقی اور اس زمانہ کی ہندی سادگی اور نرمی کا بہت شدت سے احساس تھا کبھی کبھی جب فارسی غزلیں ان پر اثر نہ کرتیں تو ہندی گیت ان کے دل کو چھو جاتے۔ جوامع الکلام میں ایک مباحثہ دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گیسو دراز کی خانقاہ میں ہندوستانی گیتوں کا مطالعہ کیا جاتا اور ان پر بحث ہوتی۔ اس وقت تک ہندی کے بھگتی گیت سماع میں اہم مقام حاصل کر چکے تھے۔ اس طرح صوفیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ روحانی میدان میں قدم رکھا اور ایک دسرے کی جمالیاتی اقدار کی قبولیت کے دروازے کھول دیے جس نے مسلمانوں کے تہذیبی رویہ میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔''

حضرت امیر خسرو سے تقریباً پچاس سال بعد ملاّ داؤد (۱۳۷۰ ـ ۱۴۵۰) نے مثنوی چندائن لکھی جس کا ذکر ملاّ عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ میں بھی کیا ہے جس کے مطابق اس مثنوی کو عہد اکبری میں بھی بہت شہرت حاصل تھی۔ بعد میں چندائن کے طرز پر بہت سی مثنویاں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ انیسویں صدی تک جاری رہتا ہے۔ چند اہم مثنویوں کے نام یہ ہیں:

قطبین کی میگاوتی، جائسی کی پدماوت (1540) منجھن کی مدھومالتی،

شیخ عثمان کی چتراولی، شیخ بنی کی گیان دیپ وغیرہ۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ سب اعلیٰ پایہ کے صوفی اور باشریعت عالم تھے۔ اپنے زمانہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور کوئی ان کی بھگتی شاعری پر انگلی نہیں اٹھاتا تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے قابل ذکر بھکت اور صوفی شعرا میں سرفہرست کبیر (۱۳۹۸) اور ان کے ساتھی نرگن شاعروں کی پوری جماعت ہے۔ اس کے بعد ایک اور قابل ذکر صوفی شاعر حضرت عبدالقدوس گنگوہی (۱۴۵۶۔ ۱۵۳۷) ہوئے ہیں جو ایک مشہور عالم دین تھے۔ وہ اکبری دربار کے صد الصدور شیخ عبد النبی کے نانا تھے۔ کہا جاتا ہے ہر صبح ان کی خانقاہ میں پرانیام (یوگا) ہوتا تھا۔ الکھداس ان کا تخلص تھا۔ رشدنامہ (الکھبانی) کے نام سے ان کے دوہوں کا مجموعہ آج بھی دستیاب ہے۔

اسی زمانہ میں گورونانک (۱۴۶۹ ۔ ۱۵۳۸) ہوئے ہیں جو ہندی شاعری کی اسی روایت کا حصہ تھے اور جن کی بانی میں کھڑی بولی۔ فارسی ، پنجابی اور برج بھاشا کا حسین امتزاج ملتا ہے اور جو اسلامی تصوف سے بھی متاثر تھے۔

نانک کی موت کے چھ سال بعد دادویال (۱۵۴۴ ۔ ۱۶۰۳) پیدا ہوئے ہیں۔ وہ پیدا تو گجرات میں ہوا۔ مگر اس کی زندگی کا بیشتر حصہ راجستھان میں گزرا۔ وہ گجراتی ، مراٹھی ، مارواڑی، سندھی، فارسی اور ہندی سبھی زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ تاہم اس کی شاعری پر راجستھانی کا زیادہ اثر تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اکبر اور رحیم کا ہم عصر تھا لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ وہ دونوں میں سے کسی سے ملا بھی کہ نہیں، اکبر اور رحیم کے ساتھ دادو کا ذکر نہیں ملتا ہے گرچہ اس سے وابستہ بہت سے ہندو شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ وہ مسلمان تھا اور اس کا اصل نام داؤد تھا۔ 22

رحیم سے پہلے ہم نے ہندی زبان و ادب کے پس منظر کا مختصر تعارف

کرایا تا کہ ہم رحیم کی شاعری کو صحیح سیاق و سباق میں سمجھ سکیں۔ رحیم خلا میں پیدا نہیں ہوا بلکہ چھ سو سال پر پھیلی ہوئی جاندار روایت اس کے سامنے تھی جس پر اس نے اپنی شاعری کا شاندار قصر تعمیر کیا۔

رحیم کی ہندی شاعری کا جائزہ لینے سے پہلے اب اکبری اور جہانگیری درباروں میں ہندی کی صورت حال کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

اس عہد میں برج بھاشا ایک فیشن کی زبان تھی جس میں لکھنا پڑھنا قابل فخر سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ٹوڈرمل نے اگر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فارسی کو سرکاری زبان بنانے کی سفارش نہ کی ہوتی تو برج بھاشا مغل دربار کی سرکاری زبان ہوتی۔ یہ بیان مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے تاہم برج باشا کی مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ امرا و اشہزادے اس زبان میں شعر کہتے تھے۔ خود اکبر سے چند دوہے منسوب کیے جاتے ہیں۔ تزک میں جہانگیر نے دانیال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ہندی میں بھی شعر کہتا تھا۔

غوّاصی جہانگیر کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے طوطی نامہ کو جو نثر میں تھا اس طرح نظم کیا کہ ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا ہندی میں لکھا۔ فیضی کے ایک دوست ملاّ نوری ہندی میں بھی شاعری کرتے تھے ان کا ایک شعر ہے۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ ترسد

بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

شیخ محمد شاہ جو فربلی کے نام سے بھی مشہور تھے۔ ہندی کے اچھے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ دربار سے ان کا تعلق تھا۔ بادشاہ نے حصار کی جاگیر دے رکھی تھی۔ ایک مرتبہ سفر میں ایک ہندو لڑکی سے ملاقات ہوگئی۔ اس کی حاضر جوابی سے متاثر ہوکر اسے اپنے ساتھ لے آئے اور اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ اس لڑکی کے ساتھ سوال وجواب کی صورت میں کبت اور دوہے لکھے ہیں۔ ایک دن جب وہ سفر سے لوٹے تو ان کو دیکھ کر لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شیخ

نے پوچھا:

''کم ورگ دھرسنار۔ مم آیو بھایونہیں۔

(اے نازنین! تیری آنکھ کیوں آبدیدہ ہوئی۔ کیا میرا آنا پسند نہیں

آیا؟)

لڑکی نے برجستہ جواب دیا۔

لینھن نین نکھار۔ لمن ہتی کو درس بن۔

(چونکہ میری آنکھ تمہاری جدائی میں گرد آلود ہو گئی تھی اس لیے میں

نے انہیں آنسوؤں سے دھولیا)

راجہ سورج سنگھ ہندی کے ایک شاعر کو جہانگیر سے متعارف کراتا ہے۔ شاعر ایک اچھوتے مضمون کی نظم بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے، بادشاہ خوش ہو کر اسے ہاتھی انعام میں دیتا ہے۔

''ذخیرۃ الخوانین (شیخ فرید بھکری) میں کثرت سے ہندی الفاظ کا استعمال پایا جاتا ہے اکبر و جہانگیر کے عہد میں رائج تھے۔ جو اس زمانے کی کسی دوسری فارسی تصنیف میں نہیں ملتا ہے۔ چند ہندی الفاظ نموتاً نقل کیے جاتے ہیں۔

پوت ۔ مریم مکانی اکبر کو پوت کہہ کر بلائی تھی۔

چھاگل۔ گھڑا، کھنڈ ۔ حصہ، بھٹیارہ۔ باورچی، بگھار۔ چھونک، پڑی۔ پڑیا

جھول ۔ کپڑے کی چادر جو بیل بھینس کی کمر پر ڈالی جاتی ہے۔

چھلا۔ دلدل، کڑاہی۔ کڑا، سودی ۔ پنساری، چرن۔ بھانڈ، منہار۔ چوڑی فروش، اوڑھنی۔ عورتوں کا دوپٹہ، لونگ۔ لنگی، ٹانکا۔ ٹانکا

ذخیرہ کے مصنف نے لفظ بارہہ جو پہلی بار اکبر کے دور میں سید امیروں کے لیے استعمال ہوتا تھا تشریح کی۔ چند موسیقی کے راگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جیسے جاکری۔ کافی ۔ بشنوپد۔ سنگھار۔ پوبیہ۔ دوہرا۔ مصنف نے ہندی کے بہت سے

ایسے فقرے بھی لکھے ہیں جو اس زمانہ میں ہندو مسلمان امرا عام بولتے تھے۔ جیسے مرشان (ہم مرجائیں گے) مار، مار 23ے

بیرم خاں سے چند ہندی اشعار بھی منسوب کیے ہیں جیسے ایک شعر ہے۔

گھر گھر میت نہ کر سکھی۔ ایک گاؤں ایک میت

شیخ مرتضٰی خاں بھکری کا ایک مصرعہ ہے

آگ لگنتی جھونپڑا جو بچ جائے لابھ

ایک اور شعر ہے۔

کہاں لگ بھکان کروں، اودت رام داس

تیرے دیے مال کون ہمال ہی ریت ہیں

(اودت، رام داس کے بیٹے! تمہاری تعریف کہاں تک کروں تم نے جو پیسہ دیا ہے اسے لے جانے کے لئے ایک قلی کی ضرورت ہے۔)

داد اسے سرس باپ، باپ سے سرس آپ

مہابلی بیرم کے بنس کو سوبھاوے ہے

(باپ دادا سے عظیم ہے۔ جو تم باپ سے، بیرم کے خاندان کی عظمت تم سے ہے)

بڑے باپ کے ہوتا ہے بڑے باپ کا پوت (ذخیرۃ)

مقامی ہندو راجاؤں سے رحیم کے اچھے تعلقات تھے۔ راجہ مان سنگھ اور ٹوڈرمل اس کے اچھے دوست تھے۔ اودے پور کے راجہ رانا امر سنگھ اور ریوا کے راجہ رام چندر سے بھی رحیم کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان سے خط و کتابت بھی ہوتی تھی اور مصیبت میں وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے۔ رانا امر سنگھ جہانگیر کی فوجوں کے خوف سے جنگلوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ اس وقت وہ رحیم

کو دوہے لکھ کر بھیجتا ہے اور اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ رحیم بھی دوہے میں جواب دیتا اور معذرت کرتا ہے کہ اب خود اس کی حالت ایسی نہیں کہ کسی کی مدد کر سکے۔

رحیم کے دربار میں جہاں فارسی کے بے شمار شاعر ملازم تھے وہاں ہندی کے بھی بہت سے شاعر اس کے خزانہ سے تنخواہ پاتے تھے۔ بقول ملاّ عبدالخالق نہاوندی جو رحیم کا سوانح نگار تھا۔ جتنے فارسی شاعروں نے رحیم کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ اس سے کہیں زیادہ ہندی شاعروں نے اس کی شان میں نظمیں لکھیں۔ راجستھان کا شاعر آس کرن جس کا تخلص 'جاڈا' تھا رحیم کی تعریف میں نظم لکھ کر لاتا ہے جو رحیم کو پسند آتی ہے اور شاعر کو ایک لاکھ روپیہ انعام میں دینا چاہتا ہے مگر وہ قبول نہیں کرتا۔ اس کے بدلے شاعر اپنے راجہ جگ مل سے بادشاہ کی صلح صفائی کراتا ہے اور راجہ جگ مل کو رحیم بادشاہ سے اس کا کھویا ہوا علاقہ واپس دلا دیتا ہے۔ جہانگیری عہد کا مشہور شاعر کیشو داس جہانگری چندریکا نام سے کتاب لکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے اس نے یہ کتاب اس وقت لکھی جب رحیم، جہانگیر (سلیم) کا اتالیق تھا اور جو اس نے جہانگیر کی تربیت کے لیے لکھی تھی۔

اُن ہندی کویوں کی فہرست کافی طویل ہے جنہوں نے رحیم کی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔ مدن، پرساد، شانتا کوی، ہری ناتھ، نرہری، پرسدھ، سنت، مکند، الاکولی وغیرہ بے شمار نام ہیں جو رحیم کے درباری کوی تھے اور جنہوں نے رحیم کی تعریف میں نظمیں لکھیں۔ ان کا کلام موجود ہے اور کتابوں میں درج ہے۔ رحیم کے ہم عصر شاعروں میں چند نام بہت نمایاں ہیں جیسے سوامی تلسی داس، گنگ کوی، شری کرشن دیوگ اور رودر۔ گنگ تو رحیم کے ہندی کے استاد تھے۔

گنگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ایک بلند پایہ شاعر تھا بلکہ اسے رحیم سے زیادہ قربت حاصل تھی۔ وہ اس کا معتمد خاص تھا۔ رحیم نے اسے چھتیس لاکھ روپے انعام میں دئے تھے۔ جہانگیر بادشاہ نے گنگ کو ہاتھی کے

پاؤں تلے کچلوا کر مروا دیا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا قصور کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ رحیم کے ساتھ اس کی دوستی وجہ ہو کیوں کہ جہانگیر رحیم سے خوش نہ تھا اور وہ ان کے تعلقات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ رحیم نے بادشاہ سے گنگ کو معاف کر دینے کی بھی درخواست کی تھی جو مسترد کر دی گئی۔ بہت سے اس عہد کے مورخین نے اس المناک واقعہ پر روشنی ڈالی مگر کوئی ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکا کہ گنگ کے مارے جانے کے اسباب کیا تھے۔

تلسی اور رحیم کے باہمی تعلقات بتائے جاتے ہیں۔ رحیم کو قنوج اور جونپور کی جاگیریں ملی تھیں۔ کہا جاتا ہے جب وہ وہاں گئے تھے تو راستہ میں بنارس میں تلسی داس سے ملے تھے۔ دونوں میں خط و کتابت بھی تھی۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک غریب اپنی لڑکی کی شادی کے لیے امداد مانگنے تلسی داس کے پاس آیا۔ تلسی نے اسے رحیم کے پاس بھیجا اور دوہے کا ایک مصرعہ 26؎ (ہندی دوہا) بھی لکھ بھیجا۔ رحیم نے غریب کو بہت سا دھن دولت دیا اور جواب میں دوہے کا دوسرا مصرعہ 27؎ (ہندوی دوہا) لکھ کر تلسی کے پاس بھیجا۔

شری کرشن دیوگ سنسکرت کے شاعر تھے۔ اس نے 'جاتک پدھتی ادھارن' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں رحیم کا بھی ذکر کیا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں رودر کوی (۱۶۰۹ ـ ۱۶۳۱) نے ''خانخاناں چرت'' کی رچنا کی جس میں رحیم کی شجاعت و سخاوت کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کتاب کا ممدوح و مخاطب رانا پرتاپ ہے کوی مغل بادشاہ سے جس کیدوستی کرانا چاہتا ہے۔ کتاب کے لکھنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ کوی سورج کی تعریف کرتا ہے۔ بادشاہ کو سورج سے تشبیہ دیتا ہے اور خانخاناں میں سورج کی خصوصیات دیکھتا ہے۔ خانخاناں کو وہ کرن، بھوج' وکرم جیسے اورتاروں کے نام سے یاد کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ رحیم جب جنگ کا آغاز کرتا ہے تو اس وقت راجاؤں کا تو ذکر ہی کیا سورج بھی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ خانخاناں پرتاپیوں میں سوریہ سہش۔ لیش میں چندر پر جا کے پتا۔ کرودھی ہونے پر یم راج،

گنیوں کے لیے کلپدرم، ستریوں کے لیے کام دیو، پرتیت ہوتے ہیں۔

ہندی ادب میں رحیم کی شاعری کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ اس عہد کے چند عظیم شعرا جیسے سور، تلسی، کیشوداس اور کبیر کے ساتھ رحیم کا نام بھی جوڑا جاسکتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی ان سے کم نہیں تھے۔ ہندی میں ان پر آج پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جاتے ہیں۔ ان کا کلام نصاب میں داخل ہے۔ ان کے دوہے ضرب المثل بن گئے ہیں۔ اس لیے اس باب میں ان کے کلام کی خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

رحیم کی ہندی شاعری کے بارے میں بعض ہندی تنقید نگاروں نے شک و شبہ کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ رحیم نام کا کوئی دوسرا شاعر تھا جس کا کلام خانخاناں سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس دعوے کی کوئی بنیاد نہیں اس لیے ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ رحیم کے سوانح نگار عبدالباقی نہاوندی نے اپنی کتاب مآثر رحیمی، ذخیرۃ الخوانین اور مآثر الامرا نے صاف لکھا ہے کہ وہ فارسی، اور ہندی اور دیگر زبانوں پر دسترس رکھتا تھا۔ ''خانخاناں در قابلیت و استعداد یکتائے روزگار بود و زبان عربی و ترکی و فارسی و ہندی می دانست و از اقسام دانش عقلی و نقلی حتی علوم ہندی مہرہ دانی داشت و زبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے'' یہ ہم عصر تاریخی شہادت ہے۔ جس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ مغل فوجوں کا سپہ سالار ترکی و ایرانی روایت و کلچر کا پروردہ رحیم اور ہندی شاعر رحیم سے مختلف ہے۔ یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ دو مختلف افراد ہوں۔ کچھ مسلمان محققین نے اس لیے رحیم کی ہندی شاعری پر شک کیا ہے کہ اس میں رام اور کرشن کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ اور شیخ احمد سرہندی جیسا بزرگ اور صوفی ایسے شخص کی تعریف نہیں کرسکتا لیکن رحیم کی ہندی شاعری کا گہرا مطالعہ قطعی طور پر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس طرح کی شاعری رحیم کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں کرسکتا تھا۔ ان کے دوہوں میں ان کی زندگی کی تصویر

صاف جھلکتی ہے بلکہ بعض دوہے تو صاف صاف ان کی زندگی کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ رحیم کی رواداری ، وسعت قلب، فراخدلی اور دریا دلی، سیاسی زندگی کا ان کا تجربہ، حکمت و دانش کی باتیں، ہندو، سنتوں اور مسلمان صوفیوں سے ان کی دوستی، اس سب کی جھلکیاں ان کی شاعری میں صاف نظر آتی ہیں۔ جہاں تک رام و کرشن کے تیئں ان کی بھکتی کا سوال ہے تو اس عہد میں مسلمانوں کی بھکتی روایات ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی۔ کوئی اس پر ناک بھوں نہیں چڑھاتا۔ مسلمان صوفیا کی طویل فہرست ہے جو رام و کرشن اور ہندو دیوی دیوتاؤں کی شان میں قصیدے لکھتے نظر آتے ہیں لیکن ان کے خلاف کوئی کفر کا فتویٰ جاری نہیں کرتا۔ ملاّ عبدالقادر بدایونی جیسے کٹر اور شمشیر برہنہ شخص نے بھی اس طرح کی شاعری پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانو ں نے کچھ ہندو روایات کو دل سے اپنا لیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں ہندی کے مشہور ناقد مایاشنکر یاگک نے رحیم کے منتشر کلام کو ایک جگہ مرتب کیا اور ہندی جگت سے ان کی شاعری کا تعارف کرایا۔ یاگک کا مرتب کلام رحیم کی شاعری کا کلیات سمجھنا چاہیے اور جو سب سے زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے کلیات بھی مرتب ہوئے ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

۱۔ رحیمن ونود۔ مرتبہ ہندی ساہتیہ سمیلن۔ ۲۔رحیم کو تیاولی مرتبہ سریندرناتھ تیواری۔ ۳۔رحیم ولاس مرتبہ برج رتن داس ۴۔رحیم مرتبہ پنڈت رام نریش ترپاٹھی ۵۔ رحیمن چندریکا مرتبہ رام ناتھ سمن ۶۔ رحیم نشتک مرتبہ لالہ بھگوان دین۔

## تصانیف

رحیم نے شاعری کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں ایک تصنیف ان سے منسوب کی جاتی ہے جن کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

## دوباولی

دوہا اس عہد کی سب سے زیادہ مقبول صنف تھی۔ رحیم کو بھی سب سے زیادہ شہرت دوہوں سے ہی ملی۔ دوہا ہندی کی مقبول چھند ہے جس کی اصل اُبھرنش ہے۔ دوہے لوک گیتوں میں کافی استعمال کئے گئے ہیں اور آج بھی فلمی گیتوں میں گائے جاتے ہیں۔ دوہے کی شکل غزل کے مطلع کی طرح ہوتی ہے۔ دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ ہوتے ہیں۔ پہلا مصرعہ ۱۳، ماتراؤں پر مشتمل ہوتا ہے اور اسے 'سم' کہتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں ۱۱، ماترائیں ہوتی ہیں اور اسے 'وشم' کہتے ہیں۔

رحیم کے عہد اور ان سے پہلے بہت سے دوہا گو شاعر گزرے ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ پورے مسلم دور حکومت میں دوہا گوئی کی شاندار روایت ملتی ہے۔ رحیم نے بھی دوہوں کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ تین سو دوہے ان سے منسوب ہیں۔ ہر دوہے میں رحیم یا رحیمن تخلص استعمال ہوا ہے۔ ہندی میں دوہوں پر مشتمل ست سئی لکھنے کا بھی رواج تھا یعنی سات سو دوہوں کی مکمل کتاب۔ کہتے ہیں رحیم نے بھی ست سئی کی رچنا کی تھی جو اب دستیاب نہیں ہے۔

رحیم کے دوہوں سے اس کی ہندی زبان میں مہارت اور قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سلاست، روانی، سادگی اور پرکاری میں یہ دوہے جواب نہیں رکھتے۔ان میں برج اور کھڑی بولی کا استعمال اثر آفریں ہے۔ رحیم کے دوہے سیدھے دل پر وار کرتے ہیں۔ اس معنی میں وہ کبیر سے بھی آگے ہے۔ اس کے دوہوں میں فارسی، عربی اور سنسکرت کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ عرفان بھکتی اور اخلاقیات دوہوں کے موضوع ہیں۔ (رحیم کے دوہے اب عوام و خواص کو رٹ گئے ہیں جنہیں مجلسوں میں دہرایا جاتا ہے۔ اس لیے بھی رحیم سے منسوب دوہوں سے انکار نہیں کیا جانا چاہیے۔ ہندی کلام انہیں کی وراثت تسلیم کیا جائے گا)

## نگر شوبھا

یعنی شہر کی سجاوٹ مگر اصطلاحاً اس نظم کو کہتے ہیں جو شہر کی تعریف میں ہو اور جس میں شہر کی پیشہ ور عورتو ں کے حسن و جمال کی خاص طور پر تعریف کی گئی ہو۔ یہ ایک صنف سخن ہے لیکن رحیم سے اس نام کی ایک کتاب منسوب کی جاتی ہے جو ۱۴۲ دوہوں پر مشتمل ہے۔ اس میں بہت سے دوہوں میں رحیم یا رحیمن کا نام بھی نہیں ہے پھر بھی ان کے مخصوص آہنگ و لہجے کی وجہ سے اسے رحیم کی رچنا تسلیم کرلیا گیا ہے۔ پنڈت مایا شنکر یاگک نے جو رحیم کے کلام کے مستند عالم ہیں اس کتاب کا ماخذ ایک قدیم مخطوطہ بتایا ہے۔ اس مخطوطہ پر یہ تحریر لکھی ہے۔ ''اتھ نگر شوبھا نواب خانخاناں کرت۔'' (یہ کتاب نواب خانخاناں کی لکھی ہوئی ہے) اس کتاب میں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والی خواتین جیسی جوہرنی، رنگ ریزنی، ترکن، کیتھن وغیرہ کے حسن وجمال کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ نگر شوبھا جیسی کتاب لکھنے کی تحریک رحیم کو اکبر کے قلعہ کے مینا بازار سے ملی ہوگی۔ شرنگار رس یعنی حسن کی تعریف میں ہندی ادب کی یہ ایک اہم تخلیق ہے۔

## بروئے نائکہ بھید

یہ بھی شرنگار رس میں لکھی ہوئی تصنیف ہے جس میں نائک و نائکہ کی خصوصیات کا ذکر ہے۔ اس میں ۱۱۹ چھند ہیں بروئے ہندی کی صنف سخن ہے جسے اودھی کا چھند بتایا گیاہے۔ رحیم نے بھی اسے اودھی میں لکھا ہے۔ اس صنف کو ہندی ادب میں داخل کرنے کا سہرا رحیم کے سر ہے۔ مایا شنکر باگک نے اس کتاب کے کئی مخطوطوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے شروع میں رحیم نے یہ دوہا لکھا ہے۔

کوت کہیو، دوہا کہیو، تلے نہ چھپے چھند
ورچیو یہ وچار کے یہ بروے رس کند

کہتے ہیں کہ رحیم کا ایک ملازم شادی کے لیے چھٹی لے کر گھر گیا۔ وہ وقت پر ڈیوٹی پر حاضر نہیں ہوسکا۔ اور رحیم کے ڈر کی وجہ سے دربار واپس جانے میں پس و پیش کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا اور ایک بروے چھند رحیم کے نام لکھ کر دیا جسے پڑھ کر رحیم بہت خوش ہوا۔ نہ صرف ملازم کو معاف کر دیا بلکہ انعام و اکرام بھی دیا۔ بروے چھند یہ ہے۔

پریم پریتی کے بروا چلے ہُو لگائے
سِنچن کی سدھی لیجو مرجھی نہ جائے

اس چھند سے تحریک پاکر رحیم نے بروے لکھنے شروع کیے۔ کہتے ہیں کہ یہ صنف سخن اودھی میں بڑی مقبول تھی اور اس میں لکھے لوک گیت گھر گھر گائے جاتے تھے۔ یہ بھی عام خیال ہے کہ سوامی تلسی نے ''بروے رامائن'' کی رچنا رحیم کے کہنے پر ہی کی تھی (اس بیان کے حق میں تاریخی شواہد نہیں ملتے) رحیم نے بروے کو اک معیاری صنف سخن بنایا اور اس کے ذریعہ انسانی خاکوں کو مجسم کر دیا ہے۔ ایک چھند دیکھئے جو برہا کی آگ میں جل رہی عورت کے بارے میں ہے۔ کہتے ہیں۔ مطلب۔ خوشگوار باد صبا چل رہی ے۔ مگر محبوب کے بنا تلوار کی طرح لگ رہی ہے۔ برج رتن داس جنہوں نے رحیمن ولاس مرتب کی ہے رحیم کے بروؤں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ان برووں کی زبان اودھی ہے۔ چھوٹے چھوٹے چھندوں میں ہندوستان کی سماجی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ چھند آپ بیتی کی طرح لکھے گئے ہیں۔ یہ چھوٹا سا مجموعہ ہندی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ جس طرح پد میں سورداس دوہوں میں بہاری، چوپائیوں میں تلسی اور کوت (کویتا) میں دیو کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا اسی طرح بردوں میں رحیم کا مدمقابل کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔''

## بروے

بروے نائکہ بھید کے علاوہ رحیم کے لکھے پھٹکر بروے بھی ملتے ہیں جن کی تعداد ایک سو ایک یا ایک سو پانچ ہے۔ رحیم رتنا ولی میں انہیں نقل کیا گیا ہے۔ رتناولی کے مصنف یاگک کا کہنا ہے کہ ان بردوں پر مشتمل ایک مخطوطہ انہیں میواڑ میں ملا تھا۔ رحیم کی ماں کا تعلق بھی میواڑ ہی سے تھا۔ اس لیے یہ نسخہ مستند ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ پریاگ کی میونسپل لائبیریری میں بھی ایک نسخہ ملا ہے جس میں رحیم کے لکھے بروے شامل ہیں۔ اس مخطوطہ پر لکھا ہے۔ 'خانخاناں کرِت بروے، مختلف مقامات سے جمع کردہ یہ بروے رحیم رتنا ولی میں یکجا کر دیے گئے ہیں اور مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں اور منگل آچرن چھندوں ( بھگتی بھاؤ) پر مشتمل ہیں۔ اپنے موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے یہ رحیم کی دوسری تخلیقات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ابتدائی چھندوں میں بھگوان کرشن، سوریہ، گنیش وغیرہ دیوتاؤں کی تعریف کی گئی ہے۔ رحیم نے بردوں میں بارہ ماسہ لکھے ہیں (موسموں، اساڑھ، ساون، بھادوں اور پھاگن کا بیان) بارہ ماسہ سے متعلق صرف چار چھند ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رحیم انہیں مکمل نہیں کر سکے۔ دوسری تخلیقات میں بھی نامکمل ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ رحیم کی مصروف فوجی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ بیشتر رچناؤں کو پورا کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔

## شرنگار سورٹھا

سورٹھا ہندی اصناف سخن میں دوہے کی تقلیب ہے۔ بے معنی دوہے کا اُلٹ، دوہے کے برعکس اس کا پہلا حصہ وشم اور دوسرا حصہ سم کہلاتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں گیارہ ماترائیں اور دوسرے میں تیرہ ماترائیں ہوتی ہیں۔ قافیہ دوہے کے برخلاف درمیان میں یعنی وشم کے بعد ہوتا ہے چونکہ یہاں وشم پہلے آتا ہے۔ کہا جاتا ہے شرنگار سورٹھا کے نام سے رحیم کی ایک علاحدہ تصنیف تھی جو دستیاب نہیں

اور اب جس کے صرف سات چھند ملتے ہیں جو رحیم رتناولی میں شامل ہیں۔

**مدناشٹک**

مدن عشق کے دیوتا کو کہتے ہیں یا وہ شاعری جس میں عشق و محبت کا بیان ہو۔ اشٹک آٹھ کو کہتے ہیں۔ آٹھ عشقیہ بندوں پر مشتمل نظم مدناشٹک کہلاتی ہے۔ رحیم کا مدناشٹک دستیاب ہوا ہے جو کلیات یا رتناولی میں شامل ہے۔ یہ ہندی اور سنسکرت کی قدیم ترین صنف سخن ہے۔ رحیم کے ہم عصر سوامی تلسی داس نے بھی رودار شٹک تحریر کیا تھا۔ رحیم کی یہ تصنیف یا تخلیق سنسکرت شیلی کے مالنی چھند میں لکھی گئی ہے اور کھڑی بولی میں شاعری کی ایک بہترین مثال ہے لیکن جس میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ فارسی اور سنسکرت لفظوں کو ملا کر نظمیں لکھنا ہندی شاعری کی قدیم روایت ہے جس کے پیش رو حضرت امیر خسرو تھے۔ رحیم کے عہد تک یہ روایت چلی آرہی ہے۔ رحیم کے دوہے ہوں یا مدنا اشٹک، عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کے الفاظ کا ملا جلا استعمال ملتا ہے اور زبان کا یہ مشترکہ استعمال اس عہد کا رواج معلوم ہوتا ہے رحیم ہو یا گنگ یا ہرہری۔ یا تلسی ہر ایک کے یہاں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ رحیم کے مدناشٹک سے ایک چھند ملاحظہ کیجیے:

ترل ترنی سی ہیں تیر سی نوکداریں
امل کمل سی ہیں تیرسی نوکداریں
مدھر مدھوپ ہیریں سال مسی نہ راکھیں
ولسی من میرے سندری شیام آنکھیں

زبان و بیان کے اعتبار سے اس شاعری کو رحیم کے ابتدائی دور کی بتایا گیا ہے چونکہ اس میں وہ روانی پختگی اور سلاست نہیں جو بعد کے کلام میں پائی جاتی ہے کرشن اور رادھا کا پیار کرشن کی بنسی اور گوپیاں مندناشٹک کا موضوعات ہیں۔

## کھیٹ کوتک جاتکم

سنسکرت زبان میں لکھی گئی یہ تصنیف علم نجوم سے متعلق ہے اور آج بھی دستیاب ہے۔ جس میں فارسی آمیز سنسکرت استعمال کی گئی ہے۔ جاتکم میں کل ۲۳ شلوک بتائے جاتے ہیں جو سیارہ شمس، قمر، عطارد، مشتری، زحل، مریخ وغیرہ کے پھل اور راجیوگ سے متعلق ہیں۔ سنسکرت زبان کے مسلمان شاعروں کے بارے میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔جس میں رحیم کی یہ تصنیف بھی شامل ہے۔

## پھٹکر

مایا شنکر یا گک نے اس عنوان کے تحت رحیم کے متفرق اشعار جمع کر دیے ہیں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ان میں چار کوٹ ، پانچ سویے (سواسو) دو دوہے اور دو پد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رحیم کے سنسکرت اشلوکوں کا مجموعہ بھی رتناولی میں شامل ہے۔ رتناولی میں شطرنج کے بارے میں رحیم کی لکھی ایک کتاب کا بھی ذکر ہے۔

## خصوصیات کلام

رحیم کے دوہوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندی زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اس کے یہاں زبان کا تخلیقی استعمال پایا جاتا ہے۔ اس طرح کی زبان وہی لکھ سکتا ہے جو ہندی کے علاوہ سنسکرت کے بھی ادبی سرمایہ سے واقف ہوا ور غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہو۔ اس کے دوہوں میں صناعی وصنعت گری کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ رحیم اپنی النکار و چھند یوجنا یعنی صنائع بدائع کے استعمال کے لیے مشہور ہے جس کی وجہ سے اسے ہندی ادب میں بلند مقام دیا جاتا ہے۔ اس کے کلام میں تلمیحات، تشبیہ و استعارے کی بھرمار ہے۔ بہت کم دوہے ہیں جن میں تشبیہ اور استعارے نہ ہوں۔ وہ زیادہ تر تلمیحات ہندو اساطیر سے لیتے ہیں۔ اس طرح کی تلمیحات کا استعمال وہی شخص کرسکتا ہے جو ہندو مذہب

سے پوری طرح واقف ہو۔ جس نے وید، اپنشد، مہابھارت اور رامائن کا گہرا مطالعہ کیا ہو اور نہ صرف مطالعہ کیا ہو بلکہ ہندو مذہبی روایات کے زیر سایہ پروان چڑھا ہو۔ چھندودھان کا تعلق عروض سے ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رحیم نے کن کن بحروں میں زمینوں میں دوہے لکھے ہیں۔ یہ پیچیدہ نظام ہے اور نامانوس ہونے کی وجہ سے جس کا سمجھنا مشکل ہے۔ رحیم لفظوں کی تکرار یعنی تنافر لفظی سے صوتی آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایہام گوئی اور ذو معنی الفاظ کا استعمال بھی اس کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

رحیم کا رجحان سلیس و سادہ زبان استعمال کرنے کی طرف ہے۔ اس زمانہ میں سنسکرت آمیز ہندی لکھی جاتی تھی۔ مگر رحیم تدسم لفظوں پر تدبھو لفظوں کو ترجیح دیتا ہے۔ یعنی سنسکرت کے اصل الفاظ کی بجائے اس کے یہاں سنسکرت کے وہ الفاظ پائے جاتے ہیں جو کثرت استعمال سے دوسری زبانوں میں آسان وشستہ ہوگئے ہیں۔ عربی و فارسی کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کرتا ہے جیسے زور، مصری، شکل، نصیحت، حضور، کاغذ، بازو، روزی، باز، سزا، خون، خوشی، جہاں، عزت، سلام، نقارہ، دل، درد، سپاہ، فضیحت وغیرہ۔ مگر یہ الفاظ بھی اس کے یہاں ہندی کا حصہ بن گئے ہیں اور غیر مانوس معلوم نہیں ہوتے۔ اس کے دوہوں میں تغزل کا رنگ بھی جھلکتا ہے جو اس عہد کی مقبول ترین صنف سخن تھی۔

رحیم کی شاعری کی ایک اور خصوصیت تنوع ہے۔ اس نے بے شمار موضوعات کا اپنے دوہوں میں احاطہ کیا ہے۔ جھونپڑی سے محلوں تک زندگی کی رنگا رنگ جھلکیاں اس کے دوہوں میں پائی جاتی ہیں۔ خود رحیم کی زندگی طرح طرح کے تجربوں سے گزری اس لیے اس کی شاعری میں بھی یہ تنوع در آیا ہے۔ حکمت و دانش کی باتیں بھی اس کے کلام کی ایک خصوصیت ہے جو تجربہ کی آنچ سے ہی جنم لیتی ہیں۔ اس کے بعض دوہوں نے کہاوتوں اور ضرب الامثال کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اور ان میں پند ونصائح اور اخلاقیات کی تعلیم بھی پائی جاتی ہے۔

رحیم کی شاعری میں بھگتی کا رنگ غالب ہے جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ رحیم جو مغل روایات میں پلا بڑھا اور جس کی تمام زندگی میدان جنگ میں گزری اسے ہندو مذہب کا اتنا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع کیسے ملا ہوگا اس پر سوالیہ نشان لگانا غلط ہے یہ درست ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بھکتی سے متعلق بیشتر دوہے الحاقی ہو سکتے ہیں۔ یہ ہم لکھ چکے ہیں کہ بہت سے ہندی اور سنسکرت کے شاعر رحیم سے وابستہ تھے اور انہوں نے اس کی شان میں قصیدے لکھے۔ یہ ممکن ہے کسی شاعر نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھکتی دوہے لکھ کر اسے دیے ہوں۔ ہندی کوی گنگ اس کا معتمد خاص تھا۔ رحیم کو ہندی شاعری کی جانب راغب کرنے میں اس کا بڑا دخل تھا۔ رحیم نے اسے اس کے اک چھپے یا چھوے (چھ بندوں والی نظم) پر ۳۶ لاکھ روپے انعام میں دیے تھے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ رحیم کے بھکتی دوہے اسی کے لکھے ہوئے ہوں۔ بہرحال ہم نے ہندی زبان و شاعری کے بارے طویل مضمون لکھ دیا ہے۔ مقصد یہی ہے کہ اردو کا عام قاری رحیم کی ہندی شاعری کی نوعیت سے واقف ہوسکے۔

## رحیم کے دوہے

करत निपुनइ गुन बिना, रहिमन निपुन हजूर !

मानहूं टेरत बिटप चढि, मोहि समान को कूर!!

جو لوگ بنا خوبیوں کے اپنی تعریف کرتے پھرتے ہیں وہ ایسے ہی
ہیں جیسے پیڑ پر چڑھ کر اپنی بے وقوفی کا اعلان کر رہے ہوں۔

कदली, सीप, भजंग मुख, स्वाति एक गुन तीन!

जैसी संगति बैठिए, तैसोई फल दीन!!

بارش کی ایک بوند کیلے کے پودے پر پڑتی ہے تو کافور بن جاتی
ہے وہی بوند سیپ میں گرتی ہے تو موتی بنتی ہے اور سانپ کے منھ

میں جانے پر زہر ہو جاتی ہے کہ چیز ایک ہے اس کی تین خوبیاں
ہیں۔ اسی طرح صحبت کا اثر ہوتا ہے۔

ए रहीम दर–दर फिरहिं, मांगि मधूकरी खाहिं!

यारो यारी छांड़िदो, वे रहीम अब नाहिं!!

آج رحیم در در بھیک مانگ کر گزر کر رہا ہے۔ وہ دن لد گئے۔
(جب وہ امیر تھا) وہ رحیم نہیں رہا اب اس کے ساتھ دوستی
چھوڑ دو۔

रहिमन मौहे न सुहाय, अभा पआवे मा बनु!

बरू वठषदेय बुलाय,मान–सहत मरबो भली!!!

بنا عزت کے تو امرت بھی اچھا نہیں لگتا۔ محبت اور عزت کے ساتھ
زہر بھی پلایا جائے۔ اچھا لگتا ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے عزت
کے ساتھ مرنا کہیں بہتر ہے۔

सीस, सांहस, सलिल, मान, सनेह रहीम!

बढ़त–बढ़त बढ़ि जात है, घटत घटि सीम!!

چاند، ہچکچاہٹ، ہمت، پانی، عزت اور محبت، یہ سب ایسی چیزیں
ہیں جو بڑھتے بڑھتے بڑھ جاتی ہیں اور جب گھٹنے پر آتی ہیں بالکل
گھٹ جاتی ہیں۔

समय पाय फल होत है, समय पात जाय!

सदा रहैं नहिं एक सी, का रहीम पछिताय!!

رحیم کیوں دکھی ہوتے ہو۔ وقت آتا ہے تو درخت پھلوں سے بھر
جاتے ہیں۔ اور پھر ایسا وقت بھی آتا ہے سارے پھل پھول جھڑ

جاتے ہیں۔ دن سدا ایک سے نہیں رہتے۔

सबै कहावैं लसकरी, सब लसकर कहं जाय!

रहिमन सेल्ह जोई सहैं, सोई जगीरै खाय!!

رحیمن! ہر کوئی فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہے اور فوجی کہلا کر خوشی محسوس کرتا ہے لیکن کامیابی اور نتیجہ میں انعام اسی شخص کو ملتا ہے جو خوشی خوشی تیروں کے وار جھیلتا ہے۔

रहिमन देखि बढ़ेन को, लघु न दीजिए डारि!

जहां काम आवे सुई, कहां करे तरवारि!!

رحیمن! بڑی چیز کو دیکھ کر چھوٹی چیز کو پھینک نہیں دینا چاہئے۔ تلوار کام آتی ہے تو سوئی کی بھی اہمیت ہے۔ یعنی کوئی بھی چیز بے کار نہیں۔

रहिमन जो रहिवो चहै, कहै वाहि के दावं!

जो रास को निसि कहै, तो कचपची दिखाय!!

رحیمن! اگر آقا کو خوش کرنا چاہتے ہو تو ہمیشہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہو۔ اگر وہ دن کو رات کہے تو تم کہو نہ صرف رات ہے بلکہ آسمان میں تارے بھی نکلے ہوئے ہیں۔

रहिमन छोटे नरन सो, होत बड़ो  नहिं काम!

मढ़ो दमामो ना बनै, सौ चुहो के चाम!!

رحیمن! چھوٹے لوگ کوئی بڑا کام نہیں کرپاتے۔ چوہے کی کھال

سے نقارہ نہیں بن سکتا۔

रहिमन चुप हुवै बैठिए, देखि दिनन को फेर!

जब नीके दिन आइहैं, बनत न लगिहैं देर!!

بُرے دن آنے پر خاموش ہوکر بیٹھ جایئے۔ جب قسمت کروٹ
لے گی خود بخود اچھے دن آجائیں گے۔

रहिमन कहत सु पेट सो, क्यों न भयो तु पीठ!

रीते अनरीते कहै, भरे बिगरत दीठ!!

رحیمن! بار بار پیٹ سے کہتا ہے کہ تو پشت کیوں نہیں دکھاتا ہے۔
اس لیے کہ اگر تو خالی رہتا ہے تو برے کاموں کی طرف راغب
ہوتا ہے۔

मुदमंडली मे सुजन, ठहरत नहीं बिसेखि!

स्द्याम कचन में सेत ज्यों, दूरी कीजियत देखि!!

اچھا اور عقلمند آدمی بے وقوفوں کی صحبت میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتا۔
اور اسے وہ الگ کر دیتے ہیں اسی طرح جیسے کالے بالوں میں
سفید بال کو الگ کر دیا جاتا ہے۔

बड़े बड़ाई ना करें, बड़ो न बोले बोल!

रहिमन हीरा कब कहै, लाख टका मम मोल!!

رحیم! بڑے لوگ اپنے منھ سے اپنی بڑائی نہیں کرتے۔ ہیرا کبھی
نہیں کہتا کہ میری قیمت ایک لاکھ روپیہ ہے۔

निज कर क्रिया रहीम कहि, सिधि भावी के हाय!

पांसा अपने हाथ में, दांव न अपने हाय!!

رحیم! آدمی عمل ہی کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یا انعام خدا کے ہاتھ
میں ہے۔ وہ پانسا پھینک سکتا ہے۔ داؤ لگا سکتا ہے ۔ ہار و جیت
اس کے ہاتھ میں نہیں۔

दीन सबन को लखत है, दीनहिं लखे न कोय!

जो रहीम दीनहिं लखैं, दीनबंधू सम होय!!

غریب سب کی طرف دیکھتا ہے مگر غریب کی طرف کوئی نہیں
دیکھتا۔ رحیم اور جو شخص غریب کی مدد کرتا ہے وہ واقعی دیوتا کے
مانند ہے۔

थेरो किए बढ़ने की, बड़ी बड़ाई होय!

क्यों रहीम हनुमं को, गिरघर कहत न कोय!!

اگر بڑا آدمی چھوٹا سا بھی کام کرتا ہے تو ساری دنیا میں اس کا ڈنکا
بج جاتا ہے۔ مگر چھوٹا آدمی بڑا کام کردے تو اس کا نام نہیں لیتے
(دیکھو ہنومان درونا چل جیسا پہاڑ اٹھا کر لنکا لے گیا۔ اس کو کسی
نے نہیں پوچھا۔ کرشن نے چھوٹا سا گوردھن پہاڑ اٹھا لیا، اسے
گردھر کا خطاب مل گیا)

कमला घिर न रहीम कहि, यह जानत सब कोयक

पुरूषपुरातन की बघू क्यों न चंचला होय!!

رحیم! لکشمی (دولت) ایک جگہ نہیں ٹھہرتی۔ بے وقوف ہی یہ سمجھتے
ہیں کہ دولت ان کے پاس سے نہیں جائے گی۔

एकै साधे सब सधै, सब साधे सब जाय!

रहिमन भूलहिं सीचिबो, फूलहि फलहि अघाय!!

رحیمن! ایک بنیادی کام اچھی طرح پورا کر لو۔ ہر کام میں ہاتھ مت
ڈالو۔ ایک درخت کی جڑ پر محنت کر لو تو پھر سارے پھل اور پھول
تمہارے ہو جائیں گے۔

आप न काहू काम के, डार पात फल फूल!

औरन को रोकत फिरैं, रहिमन पेड़ बबूल!!

رحیمن! ببول کا پیڑ (جو دوسروں کو فائدہ نہیں پہنچاتا) خود اپنے لیے
بھی بیکار ہے نہ اس میں پتیاں ہیں اور نہ ڈالیں۔ نہ پھل اور نہ
پھول۔ دوسرے پودے بھی اس کے قریب پروان نہیں چڑھتے۔
ایک بیکار آدمی بھی ایسا ہی بے برگ و گیاہ ہوتا ہے۔

रहिमन वे नर मर चुके, जे कहूं मंगन जाहिं!

उनते पहले वे मुए, जिन मुख निकसत नाहिं!!

رحیمن! ایسے لوگ مر چکے جو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے جاتے ہیں
اور ان سے پہلے وہ مر گئے جن کے منہ سے نا نکلے۔

रहिमन लाख भली करो, अगुनी अगुन न जाय!

राग, सुनत पय पिअतह, सांप सहज घरि खाय!!

رحیمن! خراب آدمی کے ساتھ کتنا ہی اچھا برتاؤ کر لو وہ بُرا ہی
رہتا ہے جس طرح سانپ کے سامنے جتنا چاہے بین بجاؤ اور اسے
دودھ پلاؤ تب بھی وہ کاٹے گا۔

रहिमन निज़ मन की बिया, बनही राखो गोम!

सुनि अठिलैहैं लोग`ब, बांटि न लैहै कोय!

رحیمن! اپنا دکھڑا اپنے تک رکھو دوسروں کے سامنے اپنا دکھڑا روتے

پھروگے تو لوگ مذاق ہی اڑائیں گے۔

अब रहीम मुसकिल पड़ी, गाढ़े दोऊ काम!

सांचे से तो जग नहीं, झूठे मिले न राम!!

رحیم بڑی مشکل آن پڑی ہے۔ سچائی کی راہ اپناتا ہوں تو دنیا نہیں

ملتی اور مکروفریب سے خدا نہیں ملتا۔

रहिमन जिहा बावरी, कहिगी सरग पताल!

आपु ता`कहि भीतर रही, तूती खात कपाल!

رحیمن! اس پاگل زبان کو کیا کیجئے جو الٹا سیدھا بک کر خود تو اندر

چلی جاتی ہے اور آدمی کو جوتیاں کھانی پڑتی ہیں۔

जो रहीम ओछो बढ़ै, तो अति ही इतराम!

प्यादे से फरजी भयो, टेढ़ो–टेढ़ो जाय!!

رحیم! اگر کم ظرف آدمی ترقی کر جاتا ہے تو وہ اتراتا پھرتا ہے جیسے

شطرنج کے کھیل میں جب پیادہ فرزنین بن جاتا ہے تو ٹیڑھی

چال چلنے لگتا ہے۔

रहिमन वहां न जाइये, जहां कपट को हेतक

हम तो ढारत ढेकुली, सींचत अपनो खेत!!

رحیمن! ایسی جگہ کبھی نہیں جانا چاہے جہاں جھوٹ اور فریب سے

لوگ کام نکالنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ مفت کے پانی سے اپنے

کھیت سینچتے ہیں۔

छवि आवन मोहन लाल की!

काछे काछनि कलित मुरलि कर पीत पिछोरी लाल की!!

बंक तिलक कैसर को कीने दुति मानो विघु बाल की !!

बिसरत नाहिं सखी मो मन ते चितवनि नयम विसाल की!!

नीकी हंसनि अघर सघरनि की छवि छीनी सुमन गुलाल की!!

जल सौ डारि दियो पुरइन बन डालनि मुकुतामाल की!!

आप मोल बिन मोलनि डोलनि बोलनि मदन गोपाल की!!

यह सरूप निरखे सोइ जाने इस रहीम के हाल की!!

اس جھند میں کرشن جی کا سراپا کھینچا ہے۔ ہندی میں پیکر تراشی کا یہ ایک نمونہ ہے۔ کرشن کی مرلی، پتامبر، آنکھوں کی چتون، دانتوں کی چمک، شہد سے زیادہ شیریں باتیں، موتیوں کی مالا، کرشن حسن کا مجسمہ ہے۔ وہ ایک پیکر جو ورندابن سے برج کو آتا جاتا ہے۔ اس پر نظر ٹھہرتی نہیں ہے۔ گوپیاں کرشن کے اس حسن کو بھول نہیں پاتیں خاص طور پر ان کی بانکی چتون کو۔

रहिमन बात अगम्य की, कहन सुनन की नाहिं!

जे जनत ते कहत नहि, कहत ते जानत नाहिं!!

رحیمن! خدا کو جاننے کے لیے کہنے سنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا گیان تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو جانتے ہیں وہ کہتے نہیں جو کہتے ہیں وہ اس کو جانتے نہیں۔

दुख मे सुमिरन सब करे, सुख में करे न कोय!

जो सुख में सुमिरन करे, दुख काहे को होय!!

خدا کو دکھ میں تو سبھی یاد کرتے ہیں، بات تو تب ہے جب سکھ میں بھی اسے یاد کریں سکھ میں اگر اسے یاد کرتا تو پھر دکھ

کیوں ہوتے۔

प्रीतम छवि नैनन बसी, पर छवि कहां समान!

भरी सराय रहीम लखि, पथिव आप फिरि आज!!

محبت دوئی کو برداشت نہیں کرتی۔ آنکھوں میں اک بار محبوب کی تصویر بسی تو پھر دوسری تصویر نہیں سما سکتی۔ جس طرح سرائے بھری دیکھ کر مسافر واپس لوٹ جاتا ہے۔

ओछेको सतसंग, रहिमन तहहु अंगार ज्यों!

तातो जारे अंग, सीरे पै कारो करे!!

رحیمن! اوچھے شخص سے دور ہی رہو۔ اس کی دوستی اچھی نہ دشمنی۔ اس سے نقصان ہی پہنچتا ہے جیسے کوئلہ گرم ہو تو ہاتھ جلاتا ہے۔ ٹھنڈا ہو تو کالا کرتا ہے۔

जो रहीम उत्तम प्रकृति, का करि सकत कसंग!

चन्दन विष व्यापत नहीं, लपटे रहत भूजंग!!

رحیم! جو شریف النسل انسان ہے اس پر بری صحبت بھی خراب اثر نہیں ڈال سکتی۔ صندل کے پیڑ پر سانپوں کا بسیرا رہتا ہے مگر صندل پھر بھی زہریلا نہیں ہوتا۔

घनि रहम गति मीन की, जल विछूरत जिय जातय!

जियत कंज तजि अनत बसि, कहा भैंरे को जाय!!

ہر کسی کی محبت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ مچھلی کی محبت بھونرے کی محبت سے الگ ہوتی ہے۔ مچھلی پانی سے جدا ہو کر جان دے دیتی ہے جبکہ بھونرا ایک کمل کو چھوڑ کر دوسرے میں جا بستا ہے۔

सोखे कहां नवाबजू, ऐसी देनी देन!

ज्या ज्यो कर ऊंवो करो, त्यों त्यों नीचे नैन!!

گنگ کوی رحیم سے پوچھ رہا ہے:

نواب خانخاناں نے بخشش کے ایسے دلنواز انداز کہاں سے سیکھے ہیں کہ جتنا اس کا ہاتھ دینے کے لیے اونچا اٹھتا جاتا ہے یعنی زیادہ سے زیادہ خیرات کرتا ہے اتنی ہی اس کی نگاہیں نیچے جھکتی جاتی ہیں۔

رحیم کا جواب:

देनहार कोउ और है, भजत सो दिन रैन!

लोग भरत हम पर घरैं, याते नीचे नैन!!

دینے والا تو کوئیہ اور ہے جو بھیجتا رہتا ہے ان ہاتھوں کے لیے ہم پر تو دینے کا الزام ہے۔ اس لیے خیرات کرتے وقت شرم سے میری نگاہیں خود بخود نیچی ہو جاتی ہیں۔

☆☆

# خلاصہ

عبدالرحیم خانخاناں ۱۷ دسمبر ۱۵۵۶ء کو لاہور میں پیدا ہوا تھا وہ اکبر کے پہلے وکیل (وزیر اعظم) بیرم خاں کا بیٹا تھا جو قراقوئنلو ترکمان کی ایک شاخ بہارلو سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی ماں جمال خاں میواتی کی بیٹی تھی جس کی بڑی بہن سے شہنشاہ ہمایوں کی شادی ہوئی تھی وہ دس سال کا تھا اس کے باپ کا قتل ہوگیا۔ اکبر نے خود اس کی پرورش کی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت دلائی۔ اکبر ہی سے اس نے میرزا خاں کا لقب پایا۔ ۱۵۷۲ء میں وہ اکبر کے ہمراہ گجرات گیا۔ بعد ازاں سید احمد بارہہ کی اتالیقی میں ضلع پٹن کا حاکم بنا دیا گیا جہاں اس کا باپ قتل ہوا تھا۔

اگست ۱۵۷۳ء میں جب اکبر گجرات پر اپنی تاریخی یلغار کرنے پر مجبور ہوا تو وہ بھی اس کا ہمرکاب تھا۔ سرنال کی جنگ میں جس میں باغی مرزاؤں کا استحصال کیا گیا، قلب لشکر کی قیادت میں وہ بھی شریک تھا۔ ۱۵۷۶ء میں اسے گجرات کا والی مقرر کیا گیا۔ لیکن صوبہ کے نظم ونسق کو سنبھالنے کا کام وزیر خاں ہروی کے سپرد تھا۔ اسی سال میواڑ کی مہم پر بھیجا گیا۔ ۱۵۷۸ء میں اس نے گولکنڈہ اور کمبھل میر کو فتح کرنے میں حصہ لیا۔ ۱۵۸۱ء میں شہنشاہ اکبر نے اسے ''میر عرض'' کے عہدے پر مامور کر دیا۔ اس سے پہلے اس منصب کے فرائض سات

منصب دارمل کر انجام دیا کرتے تھے۔ اسے رنتھنبور کی جاگیر بھی عطا ہوئی اور اس علاقے میں امن و امان قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔ ۱۵۸۲ء میں وہ اکبر کے بیٹے سلیم کا اتالیق مقرر ہوا جو اس وقت تیرہ سال کا تھا۔ ۱۵۸۳ء میں اسے مظفر شاہ گجراتی کی بغاوت کو فرو کرنے کی خدمت تفویض ہوئی۔ اس نے جنوری ۱۵۸۴ء میں مظفر کی زبردست طاقت کو سرنج اور نادوت کی جنگوں میں کچل ڈالا۔ اس کی فاتحانہ خدمت کے اعتراف کے طور پر اسے ''خانخاناں'' کا لقب ملا۔ اور اس وقت کا سب سے بڑا منصب پنج ہزاری بھی عطا ہوا۔ گجرات کی کمان اسی کی تحویل میں رہی۔ اس نے کاٹھیاواڑ میں مظفر کا تعاقب کیا۔ ۱۵۸۵ء میں نواں نگر کو مسخر کر لیا۔ ۱۵۸۵ء میں جب خانخاناں دربار شاہی میں حاضری دینے کے لیے گیا تو اس کی غیر حاضری کے دوران مظفر نے پھر بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ چنانچہ خانخاناں فوراً واپس آگیا اور صوبے میں دوبارہ امن قائم کیا۔ اگلے سال جب مشترکہ ولایت کا طریقہ رائج کیا گیا تو قلیج خاں کو اس کا شریک بنا دیا گیا۔ ۱۵۸۷ء میں اسے دربار شاہی میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ۱۵۹۹ء میں گجرات کا صوبہ اس کی تحویل سے لے کر اس کی بیوی ماہ بانو کے بھائی مرزا عزیز کوکہ کے حوالے کر دیا گیا۔

اسی سال وہ دربار شاہی کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوا اور شہنشاہ کا وکیل بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے جونپور کی جاگیر عطا ہوئی۔ اسی سال اس نے شہنشاہ کی خدمت میں بابر نامہ کا فارسی میں ترجمہ کیا ہوا پیش کیا۔ ۹۱-۱۵۹۰ میں اسے اس کی خواہش کے خلاف جونپور کی بجائے ملتان اور بھکر کی جاگیر دی گئی اور فوج کا سالار بنایا گیا جو قندھار اور ٹھٹھے کا راستہ روکنے کی غرض سے بھیجی گئی تھی۔ اس وقت ٹھٹھے پر جانی بیگ ترخان قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ عبدالرحیم نے قندھار پر چڑھائی کرنے کی بجائے زیادہ مال غنیمت حاصل کرنے کے خیال سے ٹھٹھہ کا رخ کرلیا۔ اس لیے قندھار کی مہم اکبر کے بیٹے

دانیال کے حوالے کر دی گئی۔ ۹۱۔ ۱۵۹۲ء میں ٹھٹھہ کی فتح پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ میرزا جانی بیگ نے اپنی بیٹی عبدالرحیم خاں کے بیٹے شاہ نواز خاں (ایرج) کو بیاہ دی اور خود عبدالرحیم کے ساتھ دربار شاہی میں چلا آیا۔

۱۵۹۳ء میں اسے شہزادہ دانیال کی مدد پر مامور کیا گیا۔ جسے دکن کی قیادت دی گئی تھی۔ لیکن عبدالرحیم کے مشورے پر یہ مہم منسوخ کر دی گئی۔ دوسال بعد جب دکن کی تسخیر کا کام ایک دوسرے شہزادہ مراد کے سپرد کیا گیا تو عبدالرحیم کو بھلسہ کی جاگیر عطا ہوئی اور شہزادے کی مدد کرنے کا حکم ملا۔ اس کے بعد مختصر سے وقفوں کو چھوڑ کر تقریباً تیں سال تک وہ دکن ہی میں مامور رہا۔ چونکہ خانخاناں نے شہزادہ مراد کے یہاں جانے میں دیر کر دی تھی اس لیے مراد اس سے بدخلقی سے پیش آیا، چانچہ اس نے معرکہ میں پرجوش حصہ نہ لیا۔ بہرکیف، ایک موقع پر اس نے کچھ سرگرمی دکھائی اور وہ اس طرح کہ بیجاپور کے سہیل خاں کی فوج کو جو اس کی فوج سے تعداد میں زیادہ تھی لڑائی میں شکست دی۔ شہزادہ کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ ہی رہے یہاں تک کہ ۱۵۹۸ء میں اسے دکن سے واپس بلا لیا گیا۔

۱۵۹۹ء میں مراد فوت ہوگیا اور دکن میں دانیال مامور ہوا۔ عبدالرحیم کو حکم ملا کہ وہ دانیال کے ساتھ ملک کر احمد نگر کا محاصرہ کرے جس کی مدافعت میں چاند بی بی بڑی شجاعت و ہمت کے ساتھ جان لڑا رہی تھی۔ احمد نگر کی فتح کے بعد دانیال اس کی صوبیداری پر مامور ہو اور عبدالرحیم کی بیٹی جانا بیگم سے اس کی شادی کر دی گئی پھر عبدالرحیم کو احمد نگر جانے اور اس علاقے میں امن قائم کرنے کا حکم ملا اور اگلے سال اسے برار، پتھیری اور تلنگانہ کی سپہ سالاری بھی مل گئی۔

جب شہزادہ سلیم، جہانگیر کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا تو دکن میں تھا۔ نئے شہنشاہ نے اسے اپنے منصب پر بحال رکھا اور مزید تسلّی دینے کے لیے

مقرب خاں کو خصوصی طور پر اس کے پاس بھیجا۔ جب احمد نگر کے نظام شاہی خاندان کے سپہ سالار ملک عنبر نے ان علاقوں کو جن پر مغل قابض ہو گئے تھے ازسرِ نو حاصل کرنے کے لیے دلیرانہ اقدام شروع کیے تو عبدالرحیم نے شہنشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ اگر مجھے کمک دی جائے تو میں فوراً اس فتنے کو کچل سکتا ہوں۔ چنانچہ جہانگیر کے بیٹے پرویز خاں کی قیادت میں ایک لشکر جرار عبدالرحیم کی مدد کے لیے بھیجا گیا لیکن فوجی سالاروں میں اتحادِ عمل نہ ہونے کی وجہ سے عبدالرحیم ۱۶۱۰ء میں ملک عنبر سے ایک ذلت آمیز معاہدہ طے کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ چنانچہ اسے سزا کے طور پر واپس بلا لیا گیا اور بدانتظامی اور غداری کے الزامات اس پر لگائے گئے۔ بہرحال جلد ہی اس کا قصور معاف کردیا گیا۔ اسے کالپی قنوج کی جاگیریں عطا ہوئیں اور ان علاقوں میں بغاوت کو دبانے کی خدمت تفویض کی گئی۔ دکن میں کھوند مغلوں کی قسمت کا ستارہ چمکا نہیں تھا، اس لیے ۱۶۱۲ء میں عبدالرحیم کو پھر دکن کی مہمات پر مامور کیا گیا۔ لیکن وہ صورت حال کو کسی حد تک سنبھال لینے سے زیادہ کچھ نہ کر سکا حتیٰ کہ ۱۶۱۶ء میں شہزادہ پرویز کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ شہزادہ خرم (بعد میں شہنشاہ شاہجہاں) کو لشکر جرار کے ساتھ دکن کی طرف بھیجا گیا۔ ملک عنبر کو شکست ہوئی اور اس نے ۱۶۱۷ء میں ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے مغلوں کے تمام علاقے انہیں لوٹا دیے گئے۔ ۱۶۲۰ء میں اس نے مغلوں کے علاقوں پر حملہ کیا اور شاہجہاں کے ہاتھوں پھر شکست کھائی۔ ۱۶۲۲ء میں شاہجہاں کو عبدالرحیم کے ساتھ دکن سے واپس طلب کیا گیا اور اسے ایرانیوں کے خلاف ایک لشکر کی قیادت سونپی گئی اور قندھار فتح کر لیا گیا۔ شاہجہاں نے قندھار کی مہم پر جانے سے انکار کردیا تھا اور اس نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ عبدالرحیم بھی اس کے ساتھ تھا یعنی اس کا ساتھ دیا شاہی سپہ سالار مہابت خاں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی وجہ سے شاہجہاں نے اسے گرفتار کر لیا لیکن جب مہابت خاں نے صلح کی شرائط طے کرنے پر

اصرار کیا تو اسے رہا کر دیا گیا۔ جب وہ شاہی افواج کے کیمپ میں پہنچا تو باغی افواج سے اس کا سلسلہ رسل و رسائل منقطع کر دیا گیا۔ اگرچہ اس نے شاہی فریق کا ساتھ دینے پر رضا مندی ظاہر کی تاہم اسے حراست میں رکھا گیا۔

۱۶۲۵ء میں جہانگیر نے اسے اپنے دربار میں بلا لیا۔ اور اس کے خطابات بحال کر کے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا۔ جب شہنشاہ نے مہابت خاں کی حراست سے، جو باغی ہوگیا تھا ط رہائی حاصل کی تو عبدالرحیم نے درخواست پیش کی کہ اسے باغی سالار کے مقابلے میں مہم لے جانے پر مامور کیا جائے۔ ۱۶۲۶ء میں اسے مہم کی تیاری کے احکام ملے اور اسے وہ تمام جاگیریں دے دی گئیں جو پہلے مہابت خاں کی تحویل میں تھیں۔ ابھی یہ تیاریاں تشنہ تکمیل ہی تھیں کہ وہ لاہور میں بیمار پڑگیا۔ اور ۱۵۳۶ھ ۷ ۱۶۲ء میں دہلی پہنچ کر 73 کی عمر میں وفات پائی۔ اس کا مزار شیخ نظام الدیان اولیا کے مزار کے قریب آج بھی موجود ہے۔ اس کے چار بیٹے اس کی زندگی ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ (۱) میرزا ایرج (داراب خاں) بھی منصب ہزاری پر فائزہوا۔ ۱۶۱۹ء میں فوت ہوگیا۔ (۲) میرزا داراب (داراب خاں) بھی ایک ممتاز سپہ سالار تھا اسے شاہ جہاں نے بغاوت کے دوران بنگال کا والی مقرر کیا تھا۔ لیکن وہ مہابت خاں کے ہاتھ لگ گیا اور مہابت نے سارے ۱۶۲۵ء ۱۶۲۶ میں قتل کر دیا۔ (۳) میرزا رحمان داد ۱۶۱۹ء میں انتقال کیا۔ (۴) میرزا امراللہ، جس کی جوانی میں موت ہوگئی۔

عبدالرحیم خانخاناں ایک ممتاز عالم اور سخنور اور سخن پرور، عربی و فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں کا ماہر تھا۔ وہ اپنی ہندی شاعری کی بدولت بہت مشہور ہے جو بھکتی کے احساسات سے لبریز ہے (جس میں وہ اپنا تخلص رحیمن کرتا ہے) وہ ادب اور فنون لطیفہ کا بڑا سرپرست تھا اور مآثر رحیمی میں ایسے شعرا کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جو اس کے خوان کرم پر پرورش پاتے تھے۔

اس کی فیاضی اور سخاوت ضرب المثل بن گئی تھی۔ اس کی فراخدلی کے واقعات بڑی تعداد میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس پر اگرچہ بارہا غداری اور بدعنوانی کے الزامات عائد ہوئے تاہم یہ حقیقت ہے کہ دکن کے مسائل پر اس کی گرفت کسی اور مغل سپہ سالار کی بہ نسبت زیادہ تھی۔

مذہبی عقائد کے اعتبار سے وہ سنی مسلمان تھا، شیخ احمد سرہندی اور شیخ عبدالحق دہلوی جیسے دینی پیشواؤں نے اسے راسخ العقیدہ مسلمان کہا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس کے مذہبی نظریات آزادنہ اور متصوفانہ تھے۔ معاصرانہ شہادت سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی کہ وہ درپردہ شیعہ عقائد کا پیرو تھا۔ اور تقیہ کرتا تھا تاہم اس کے شیعی رجحانات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ (خلیق احمد نظامی)

# کتاب کیسی ہے

١۔ علی جواد زیدی
٢۔ پروفیسر آزرمیدخت
٣۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ
٤۔ عبداللہ ولی بخش قادری
٥۔ تارا چرن رستوگی
٦۔ رام لعل نابھوی
٧۔ سجاد نقوی پاکستان
٨۔ علامہ اخلاق حسین دہلوی
٩۔ رئیس الدین فریدی
١٠۔ انور کمال حسینی

# علی جواد زیدی۔ پدم شری

بھائی شیخ سلیم احمد صاحب تسلیم

اب کے سفر دلّی کا حاصل، وہ تحفۂ خلوص و محبت ہے جو آپ کے ہاتھوں ''عبدالرحیم خانخاناں'' کی شکل میں ملا۔ ہم نے خانخاناں جیسی شخصیتوں سے جو بے توجہی برتی ہے وہ تمدنی اور ثقافتی اعتبار سے ناقابل معافی ہے۔ وہ ہندی تہذیب کے معماروں میں ایک بلند بالا شخصیت ہے جو بیک وقت جاذب نظر بھی ہے اور ایک پورے دَور ہی کی نہیں ایک عظیم وراثت کی نمائندہ بھی۔ وہ اردو ہندی اور ایرانی۔ تورانی جھگڑوں کے گرد و غبار میں دھندلا کے رہ گیا۔ اردو والوں نے اکبر کے خانخاناں اور جائسی کو ہچکچاتے ہوئے اب اپنانا شروع کیا ہے، حالانکہ یہ کام بہت پہلے ہونا چاہیے تھا۔ یہ سچ ہے کہ عہد اکبری و جہانگیری کے اکثر ادیب، شاعر اور عالم تنگ نظری کا شکار ہوئے، لیکن آخیر میں انہیں میں غالب بھی تو تھا جو اپنے کو نصف مسلمان کہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہم نے فراخ دلانہ برتاؤ کیا کیونکہ وہ خالصتاً اردو کا شاعر تھا۔ جنھوں نے اردو کے قدیم روپ میں مثلاً برج، پوربی، اودھی وغیرہ میں لکھا، اس سے نگاہیں پھیرے رہے۔ حد یہ ہے کہ صوفیائے کرام کے اس کلام سے اعتنا نہ کی جو عوامی یا ہندی سے قریب تر بولیوں میں لکھتے رہے۔ فارسی میں بھی غالب کی اس دعوت کے

باوجود کہ اُس سے صرف نظر کیا۔ بہت کم توجہ کی۔ میر کی فارسی نثر کا یہی حال ہوا۔ اردو والوں نے ابوالفضل اور فیضی کو کتنا پڑھا ہے؟ جائسی کی ''پدماوت'' کے اردو میں ترجمے ہوئے، لیکن وہ بھی کتنوں نے پڑھے ہیں؟ اب ہندی پڑھنے والوں کی تعداد بہت بڑھ رہی ہے اور اردو والوں میں بھی ہندی داں کافی مل جائیں گے، کاش ترقی اردو بیورو اس جانب متوجہ ہو اور رحیم کا وہ کلام جو اردو کی بولیوں میں ہے، آج کی اردو میں ترجمہ ہو کر آجائے تاکہ اردو کا یہ ضائع شدہ سرمایہ اردو کو واپس مل جائے۔ آپ کی تصنیف کا یہ پہلو بھی اہم ہے کہ آپ نے رحیم کے ہندی کلام کے نمونے ترجمے کے ساتھ یکجا کر دیے ہیں ارو یہ پیاس بڑھادی ہے کہ سارے کا سارا کلام اردو میں بھی منتقل ہو جائے۔

عبدالرحیم خانخاناں خوش قسمت ہے کہ ''مآثر رحیمی'' کی شکل میں اس کی ایک سوانح عمری موجود ہے۔ اور معاصر تاریخوں میں بھی مفید مواد مل جاتا ہے۔ آپ نے اس بنیادی مواد سے استفادہ کر کے ایک متوازن اور خوبصورت کتاب مرتب کی ہے، جو خانخاناں کی پہلو دار شخصیت کے ساتھ انصاف کرتی ہے اور جذبہ داری سے اوپر اٹھ کر مورخانہ دیانت کے ساتھ اس کی زندگی اور کارناموں کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کی سیاست، اس کی علمیت و ادبیت، اس کی علم وفن کی سرپستی، اس کی انسانی لغزشیں سب سامنے آجاتی ہیں۔ یہ بڑی کامیابی ہے اور میں آپ کو اس کامیاب کوشش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آپ کے یہاں خیالات، واقعات کو سلجھا کر دل نشیں انداز میں پیش کرنے کا جو انداز ہے وہ تاریخ کی سنگلاخی کو پگھلا دیتا ہے۔ قاری آپ کے بیان کی رو میں بہتا جاتا ہے۔ کہیں بھی دل کشی کم نہیں ہونے پاتی۔ آپ نے اس کتاب میں اظہار علم سے گریز کیا اور فنی مباحث سے کترا کے نکل گئے ہیں کہ کتاب کی روانی میں فرق نہ آنے پائے۔ اپنے ساتھیوں کی عام روش کو مدنظر

رکھتے ہوئے یہ بھی ایک طرح کی قربانی ہے۔ زندہ باش

☆☆

# آزرمیدخت صفوی

محترم شیخ سلیم احمد صاحب آداب

آپ سے بہت بہت معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کی عنایت کردہ کتاب کا شکریہ تو درکنار آپ کے خطوط کا جواب دینے میں بھی تاخیر ہوئی۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ کیا ہی بدتمیز خاتون ہیں۔

میں آپ سے انتہائی شرمندہ ہوں اور ہزار ہزار معذرت چاہتی ہوں میں بدتمیزی کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔'' میں آپ سے کیا بتاؤں کہ گذشتہ چند مہینوں میں دماغ کیا کیا کیفیت رہی۔ میری عزیز ترین دوست اور پھوپی کی بیٹی جو میرے ہی ہم عمر تھی دفعتاً ختم ہوگئی۔ ہم بچپن کے ساتھی اور ایک دوسرے سے بے حد قریب تھے۔ یوں کہنا درست ہوگا کہ لازملزوم تھے۔ آپ اندازہ شاید کرسکیں کہ میرے دل اور دماغ کی کیا حال تھی۔ کچھ بھی کرنے کو، پڑھنے کو، لکھنے کو دل بھی نہ چاہتا تھا۔ اب بھی بس بہت کوشش سے دماغ کو ہٹایا ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ Dipression رہتا ہے ہر کام سے۔

آپ کی کتاب رکھی رہی، بغیر پڑھے آپ کو جھوٹی تعریف لکھا

دینا اچھا نہ معلوم ہوا اور پڑھنے کی تاب وتواں ہی نہ تھی۔ آخر اب اس کو پڑھا اور سچ یہ ہے کہ پڑھ کر خود ہی دل چاہا کہ آپ کو آپ کی اس کاوش اور سعی پر مبارکباد دی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے خانخاناں کی سوانح، ان کے افکار، ان کے احوال کو جس دلچسپ اور محققانہ انداز سے پیش کیا ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ مجھے کتاب کا سب سے اہم پہلو تاریخ اور ادب کا امتزاج معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے بڑے ہی رواں، جاذب اور دلچسپ انداز میں تاریخ کے اوراق کو ہمارے سامنے رکھا ہے، اور آپ کی تحریر کی یہی سب سے نمایاں خصوصیت ہے کہ اس میں تاریخ کی سنجیدگی اور ادب کا بانکپن ہے۔ بلا مبالغہ، مجھے کتاب اس قدر دلچسپ معلوم ہوئی کہ ایک بار شروع کرنے کے بعد مسلسل پڑھتی رہی یہاں تک کہ ختم کرلی!! سچ یہ ہے کہ آپ کو زیادہ frequently لکھنا چاہئے تاکہ ادب نوار حلقے آپ کی تحریروں سے مزید لطف اندوز ہوسکیں۔

آج کل اور کیا مصروفیات ہیں، میں نے ادھر عرصہ سے کوئی مضمون وغیرہ نہیں لکھا۔ وجہ آپ کو لکھ چکی ہوں۔ اب کچھ کام شرع کیا ہے۔ دیکھئے کب تک پورا ہوتا ہے۔

ایک بار پھر بے انتہا معذرت چاہتے ہوئے۔

☆☆

## ڈاکٹر محمد انصاراللہ

شیخ سلیم احمد صاحب ترقی اردو بیورو کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور علم دوست شخص ہیں۔ انہوں نے فارسی، اردو اور انگریزی کی متعدد

کتابوں کے مطالعہ کے بعد کتاب ''عبدالرحیم خانخاناں'' لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سوانح کے علاوہ اس کتاب میں ''اس عہد کے فکری دھارے کو پیش کرنے کوشش کی ہے۔'' خانخاناں اس فکری دھارے کی علامت کے طور پر ابھرتا ہے۔ انہیں محقق یا مورخ ہونے کا بھی دعوا نہیں ہے۔ ''اعداد و شمار، اشخاص و مقامات کے ناموں اور تاریخوں سے طبعاً زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔'' اسی لیے انہوں نے بقول خود ''کتاب کو حوالوں سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔''

کچھ شک نہیں کہ شیخ صاحب نے یہ کتاب بہت محنت سے لکھی ہے اور اسے ان کے ایک مدت کے مطالعے کا حاصل سمجھنا چاہئے۔ انہوں نے خانخاناں کے زمانے کے فکری دھاروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

> ''مجدد الف ثانی کی آمد کے ساتھ ہندوستان میں بنیاد پرستی اور کٹر مذہبیت کا دور شروع ہوتا ہے۔''

اس مقام پر تلسی داس جی کا ذکر بھی کیا جانا چاہئے جو محض شاعر یا سنت نہیں تھے، بلکہ جنہوں نے ہندوستان کے فکری دھارے کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ قطع نظر اس سے کہ انہوں نے راون کے نیست و نابود کردئے جانے کی داستان سنائی تھی، ضمناً بعض ایسی باتیں بھی کہہ دی تھیں جن کے نتائج بڑے دور رس اور دیر پا ثابت ہوئے۔ مثلاً انہوں نے ڈھول، سودر، عورت اور چوپایوں کو ایک درجہ میں رکھ کر یہ حکم لگایا کہ یہ چاروں پیٹے جانے کے ہی ''ادھکاری'' ہیں۔ فکر کے دھاروں کا سراغ زبان سے بھی لگایا جاتا ہے مثال کے طور پر ملک محمد جائسی نے دودھ کے لیے معمولاً لفظ ''کھیر'' نظم کیا ہے لیکن رام چرت مانس میں ہے

ہوت پرات بٹ چھیر منگا وا

کھیر اور چھیر سے طبائع کے رجحان کا پتا چلتا ہے اور اس پہلو سے بحث بھی ضروری تھی۔

کتاب میں ضمناً شیخ عبدلقدوس گنگوہی کا بھی ذکر آگیا ہے۔ ان کے نام کے ساتھ ''گنگوہی'' کے لاحقہ سے حافظ محمد دخان شیرانی نے بھی دھوکھا کھایا ہے۔ یہ بزرگ رُدولی کے رہنے والے تھے۔ رشد نامہ انہوں نے اپنے وطن ہی میں مکمل کر لیا تھا۔ اس باب میں تصوف کے مباحث کا بیان ہوا ہے اور اپنی بات کی تائید، توضیح اور تصریح کے لئے چوپای، دوہرے وغیرہ نقل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں شیخ نے اپنے سنسکرت اشعار بھی لکھے ہیں جن کو عام سنسکرت شعروں سے ممیز کرنے کے لئے انہوں نے ''شلوک'' کے بجائے ''سرلوک'' کہا ہے اور یہ اصلاح پہلے سے مروّج تھی۔ یہ بات کہ ان کی خانقاہ میں ہر صبح ''پَرانیام'' ہوتا تھا کہاں سے لی گئی ہے، مجھے معلوم نہیں۔ یہ بھی ظاہر نہیں کہ اس مقام پر اس اصطلاح سے کیا مراد ہے۔ 24؎ دراصل اس سلسلے کے شاعروں نے بیشتر الفاظ کو ان کے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً حضرت عثمان کو ''بڑا پنڈت'' حضرت علی کو زبردست ''سنگھ'' کہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود قرآن کے لئے لفظ پُران استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ان کے کلام کا مطالعہ صحیح پس منظر میں کیا جانا ضروری ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان حضرات کی بھگتی سور اور تلسی کی بھگتی سے الگ ہے۔ ان کی بھگتی ذات مطلق کے لئے ہے جب کہ مذکورہ دونوں حضرات کی بھگتی متعین اور مخصوص شخصیتوں سے متعلق ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا یہ کتاب بہت محنت سے لکھی گئی ہے۔ مباحث یہ ہیں:

''بیرم خاں ابتدائی زندگی، گجرات کی مہم، سندھ کی معرکہ

آرائیاں، خانخاناں دکن میں، جہانگیر اور خانخاناں ، شہزادہ خرم اور خانخاناں، سیرت و شخصیت ، علم و داب اور تصوف، تعمیرات، شیخ احمد سرہندی اور خانخاناں ، رحیم کی ہندی شاعری، ان عنوانات سے کتاب کی قدر وقیت اور وقعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مصنف نے خلاصہ کے طور پر کتاب کے آخر میں کہا ہے کہ:

''خانخاناں ایک ممتاز عالم، سخنور، سخن پرور، عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں کا ماہر تھا۔ وہ ادب اور فنونِ لطیفہ کا بڑا سرپرست تھا۔ مآثر رحیمی میں ان شعرا کی طویلی فہرست دی گئی ہے جو اسی کے خوانِ کرم سے پرورش پاتے تھے۔ اس کی فیاضی اور سخاوت ضرب المثل ہے۔''

ایسے شخص کا تعارف کرانا وقت کی ضرورت ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ شیخ سلیم احمد صاحب نے اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کتاب خوبصورت اور دیدہ زیب ہے ۔ شیخ سلیم احمد صاحب نے اسے مفید تر بنانے کے لئے اس میں خانخاناں ، اکبر، جہانگیر وغیرہ کی سولہ تصاویر شامل کی ہیں اور ان کا تعارف بھی کرایا ہے۔ امید ہے کہ متعلق حلقوں میں یہ کتاب مقبول ہوگی۔

☆☆

# عبداللہ ولی بخش قادری

جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں کی سوانح ہے۔ اس کے بارے میں مصنف نے اپنے تعارف میں کہا ہے:

''عبدالرحیم خانخاناں سے متعلق ہندی اردو اور انگریزی میں جو بھی کتابیں یا مضامین میری نظر سے گزرے ہیں وہ مجھے یک طرفہ معلوم ہوئے، فارسی اور اردو میں رحیم کے ایرانی اور مغل پس منظر پر زیادہ زور ہے اور اس کی ہندی شاعری کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے جب کہ ہندی اور کسی حد تک انگریزی میں صرف ہندی شاعری اور ہندو کلچر کو موضوع بحث بنایا گیا اور اس کے مغل یا مسلم پہلوؤں کو سرسری بیان کیا گیا ہے بلکہ ہندی اور انگریزی کے مصنفین نے مغل تاریخ کے بہت سے واقعات کو غلط پیش کیا ہے۔''

کتاب کے مطالعے سے مصنف کے محتاط اور غیر جانب دارانہ رویے کا اندازہ ہوتا ہے، اپنے بیان کو حوالوں سے پایہ ثبوت کو پہنچایا ہے اور رحیم کی بھرپور زندگی کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تعارف کے بعد رحیم اور اس کے عہد سے متعلق عمارتوں، شخصیتوں اور مصوری کی چودہ پندرہ تصاویر اور ایک نقشہ دیا گیا ہے جس میں شہنشاہ اکبر کی موت کے وقت کا ہندوستان پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا پہلا باب سماجی پس

منظر پیش کرتا ہے جس کے بارے میں مصنف کا ارشاد ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے عہد کو ہندوستانی سماج کی نشاۃ ثانیہ کا عہد کہا جاسکتا ہے جس میں مذہبی رواداری، تہذیبی ولسانی ہم آہنگی اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اور رحیم بھی اسی ماحول کا پروردہ تھا۔ یہ دوسرا باب رحیم کے والد اور سلطنت مغلیہ کے ایک اہم معمار بیرم خاں کی زندگی کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان ہے ابتدائی زندگی۔ یہاں رحیم کی پیدائش سے لے کر اس کی اولاد اور شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے اتالیق مقرر ہونے تک کا حال بیان کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ رحیم کی سیاسی زندگی کا آغاز کیوں کر ہوا۔ اگلے تین ابواب کو رحیم کی گجرات کی مہم، سندھ میں معرکہ آرائیوں، اور دکن میں سرگرمیوں کے لئے وقف کیا گیا ہے اور ساتویں باب میں جہانگیر اور خانخاناں کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آٹھویں باب میں شہزادہ خرم اور خانخاناں کی کشاکش کو بیان کیا گیا ہے اس باب میں مصنف نے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ اپنے باپ کے خلاف شاہجہاں کی بغاوت خانخاناں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہیں سے خانخاناں کے سیاسی زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ جب اس کی زندگی کی شام تھی وہ مطعون وخوار ہوا۔ اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ شاہجہاں سے بے وفائی کر کے خانخاناں نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ نہ خداہی ملا نہ وصال صنم۔" نویں باب میں خانخاناں کی سیرت وشخصیت کے نقوش ابھارے گئے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ترکوں اور منگولوں سے اسے (خانخاناں) کو شجاعت وحریت فکر ملی تھی، ایرانی تہذیب نے اخلاق وآداب سکھائے تھے اور علم وہنر سے آراستہ کیا تھا۔ ہندوستانی ماں کی گود میں اس نے عرفان وبھگتی رواداری اور محبت کی تعلیم حاصل کی تھی انہوں نے رحیم کی شخصیت کی ہمہ جہتی اور رنگا رنگی کو سراہا ہے۔ اس نے واضح کیا ہے کہ وہ عیاش طبع نہیں تھا۔ سخاوت میں بے مثال تھا۔ دعوتیں کرنے اور عمارتیں بنوانے کا شوق رکھتا تھا۔ نیز علم وہنر کا

دل دادہ اور تصوف پر مائل تھا۔ دسویں باب میں قدرے تفصیل سے علم و ادب اور تصوف اور گیارہویں میں تعمیرات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ بارہویں باب کا عنوان ہے خانخاناں اور شیخ احمد سرہندی، یہاں خطوط کی روشنی میں باہمی روابط کا جائزہ لیا گیا ہے تیرہواں باب رحیم کی ہندی شاعری سے متعارف کراتا ہے۔ انہوں نے اپنے تعارف میں ذکر کیا ہے کہ عبدالرحیم خانخاناں کی ہندی شاعری کا معاملہ خاصا متنازع ہے اور لکھا ہے مگر میں اپنے مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موجودہ ہندی کلام جو ہم تک پہنچا ہے اس میں بیشتر کلام اسی عبدالرحیم خانخاناں کا ہے جو مغل دربار کا سپہ سالار اور اکبر کے نورتنوں میں ایک تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بھگتی سے متعلق دوہے الحاقی ہیں اور وہ رحیم کے نہ ہو کر کسی دوسرے ہندو کوی کے ہوسکتے ہیں۔ اس باب کے اختتام پر رحیم کی شاعری کا انتخاب اصل دوہوں اور ان کے معنوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ آخری باب میں خلاصہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد کتابیات کا اندراج ہے جو کہ فارسی اردو اور انگریزی کتب پر مشتمل ہے۔

اس مختصر کتاب میں رحیم کی حیات و صفات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس سوانح کے مصنف شیخ سلیم احمد تاریخ نویسی کے منصب سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادیب کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ لہذا ان کی اس تصنیف میں تاریخی بصیرت اور ادبی لطافت دونوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ وہ صرف رحیم کی سوانح ہی نہیں ہے بلکہ ان کے عہد کا منظر نامہ بھی پیش کرتی ہے۔ رحیم ہندی کے ایک بلند پایہ شاعر بھی ہیں اور ہندی ایرانی تہذیب کا ایک مرقع بھی۔ ان کی شخصیت اس مشترکہ تہذیبی ورثے کی نمایندگی کرتی ہے جو دو قوموں کے باہمی لین دین سے معرض وجود میں آیا۔ ہمارے موجودہ دور میں ان تصورات و احساسات کی بازیابی اور آبیاری عصری تقاضے کی حیثیت رکھتی

ہے۔ شیخ سلیم احمد کی یہ کتاب اس فضا کو قائم کرتی ہے جو موجودہ حالات میں خاص طور پر درکار ہے اور جس کو ملیامیٹ کرنے کے لئے فسطائی طاقتیں آج سر اٹھا رہی ہیں۔ یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں کا ایک اچھا تعارف ہونے کے ساتھ ساتھ وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی طرف بھی رجوع کرتی ہے۔ اس لیے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں اور عام قاری سب کی توجہ کی مستحق ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

☆☆

# تاراچرن رستوگی

تاریخ ہند میں دو شہنشاہوں کے نام کے ساتھ اعظم لکھا جاتا ہے۔ اشوک اعظم اور اکبر اعظم اور تاریخ عالم میں پانچ حکمرانوں کے اسما کے ساتھ اعظم لکھا جاتا ہے اور وہ ہیں اشوک اعظم، سکندر اعظم، اکبر اعظم، پیٹر اعظم، نپولین اعظم یعنی دنیا کی تاریخ میں بھی اشوک اور اکبر کے نام شامل ہیں۔ اشوک اور اکبر کے مابین جو مماثلت پائی جاتی ہے اس کا تاریخی جائزہ ہنوز نہیں لیا گیا ہے۔ اشوک اور اکبر دونوں عظیم انسان تھے کیوں کہ مذہبی رواداری، سماجی انصاف و تعمیر کے خیالات کو ان دونوں فرمارواؤں نے تحریک میں بدل دیا تھا۔ جس طرح اشوک اعظم نے پاٹلی پتر موجودہ پٹنہ کے قریب نواحی علاقہ میں

ایک کونسل کا انعقاد کیا تھا اسی طرح اکبر اعظم نے عبادت خانہ قائم کیا جو ابھی تک فتح پور سیکری کے قلعہ کے اندر موجود ہے۔ ہندوستانی ماحول میں اسلام اجنبی نہیں رہا بلکہ مختلف و متعدد مذہبی فرقوں کے کارواں میں شامل ہوکر ایک مشترکہ تہذیب و ثقافت کی جانب رواں دواں بڑھتا گیا۔ صوفی، اولیائے کرام اور بھکتی تحریک سے وابستہ سادھو سنت انسانیت کے اعلا اقدار کو پروان چڑھانے لگے۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد کو ہندوستانی سماج کی نشاۃ ثانیہ کا عہد کہا جاسکتا ہے جس میں مذہبی رواداری، تہذیبی و لسانی ہم آہنگی اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اکبر کی عظیم شخصیت میں صدیوں کی تہذیبی خصوصیات نیز روحانی بصیرتیں سمٹ آئی تھیں۔ اکبر پر ابھی تک یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ اس نے ایک نیا مذہب ''دین الٰہی'' کی بنا ڈالی تھی۔ شیخ سلیم احمد صاحب بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ فٹ نوٹ میں انہوں نے شیخ مبارک کے تعلق سے ''دین الٰہی'' کا ذکر کیا ہے جب کہ بدایونی کی تصنیف ''منتخب التواریخ'' اور ابوالفضل کی تصنیف آئین اکبری ہی نہیں بلکہ ان کے لکھے ہوئے رقعات و خطوط میں بھی ''دین الٰہی'' کہیں استعمال نہیں ہوا ہے۔ ''آئین اکبری'' کے ''آئین رہ نمائی'' یعنی رہنما اصول و ضوابط کو کھینچ تان کر ''دین الٰہی'' میں ڈھال لیا گیا۔ بلاک مین (Blochmann) نے آئین اکبری کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ترجمہ میں آئین رہنمائی کو Dine-e-Ellahi (دین الٰہی) کردیا۔ اس کے بعد منتخب التواریخ کے جتنے اردو تراجم ہوئے سبھی میں ''دین الٰہی'' در آیا اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو عالم اسلام میں مشہور و معروف ہستی ہیں، انہوں نے بھی اپنی تصنیف ''دعوت و عزیمت'' کو اردو ترجمے سے استفادہ کرتے ہوئے ''دین

الٰہی'' کا ذکر کیا ہے۔ ''دین الٰہی'' کی اختراع کے پس منظر میں انگریزی حکمت عملی بغایت مخفی شرارت پسندی کار فرما تھی اور ہمارا دانشورانہ طبقہ بھی جال میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ اکبر وسیع المشرب، آزادی فکر کا حامل، حق جو یا انسان تھا۔ مصنف نے شبلی کے حوالے سے اکبر کی بابت کہا ہے کہ:

> ''اکبر نے متعصب مولویوں کا زور توڑ دیا تھا اور اس طرح اس کو موقع ملا کہ وہ ایک وسیع اور آزادانہ حکومت قائم کرے جس کے سایہ میں ہندو، مسلمان یہود ونصاریٰ آزادی کے ساتھ اپنے اپنے فرائض مذہبی ادا کر سکیں۔ اور یہی طرز حکومت خلفائے راشدین نے قائم کیا تھا۔ اگر مغلوں کے عہد میں پروان چڑھنے والی قوتیں کمزور نہ پڑتیں تو ملک کی تقسیم بھی نہ ہوتی اور مسلمان برصغیر میں یوں تباہ و برباد نہ ہوتے۔''

عبدالرحیم کا والد بیرم خاں نسلاً ترک اور مذہباً شیعہ تھا۔ شیر شاہ کے انتقال کے بعد افغانوں کی طاقت منتشر ہوگئی اور اس انتشار کا فائدہ ہمایوں نے بیرم خاں کی بھرپور مدد سے اٹھایا۔ ہمایوں کی وفات کے بعد بیرم خاں نے ہمایوں کے کم سن بیٹے اکبر کی بھی بھرپور مدد کی۔ بیرم خاں شاعر بھی تھا۔ بیرم خاں کی تحویل سے آزاد ہو کر اکبر نے جب عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تو بیرم خاں فریضہ حج ادا کرنے کے لئے چل پڑا تو راستے میں پٹن کے مقام پر اس کا قتل کر دیا گیا۔ عبدالرحیم کی عمر چار پانچ سال تھی۔ اکبر نے عبدالرحیم کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کرایا اور اس کو ہمیشہ اپنا ہی بیٹا تصور کیا۔ عبدالرحیم نے

مروجہ علوم حاصل کیے اور فارسی ، سنسکرت اور برج بھاشا وغیرہ زبانوں پر بھی دسترس حاصل کر لی۔ بڑے ہو کر اس نے سیاسی زندگی میں بھی بھرپور پیش رفت کی اور اعلیٰ منصب کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ گجرات ، سندھ اور دکن میں لشکر کشی کے بہترین جوہر دکھائے۔ جناب سلیم احمد نے عبدالرحیم خانخاناں کو تاریخی تناظر میں اس طرح پیش کیا ہے کہ رحیم کے تمام خدو خال ابھر کر سامنے آ گئے یہ کمال کوئی بہترین مورخ کرسکتا ہے۔ تاریخ نویسی پر بھی مصنف کو قابل داد عبور حاصل ہے۔

سیرت و شخصیت کے اعتبار سے عبدالرحیم خانخاناں اپنے زمانے میں مثالی مقام و مرتبہ کا حامل تھا عرفان اور بھگتی ، رواداری اور محبت سے بھرپور خانخاناں ''صلح کل'' کا علمبردار تھا۔ ابوالفضل اور فیضی کی صحبت نے شہنشاہ اکبر پر جو اثرات مرتب کیے تھے اور جس حکمت عملی سے اس نے ہندوستانی قوم کی داغ بیل ڈالی تھی وہ صلح کل ہی پر استوار کی گئی تھی۔ حکومت کو کسی ایک مخصوص مذہب سے وابستہ نہیں رکھا گیا۔ شیعہ ، سنی ، ہندو، مسلمان ، نصرانی مذاہب کو برابر سمجھا جانے لگا تھا۔ عبدالرحیم خانخاناں شیعہ ہونے کے باوجود شیخ احمد سرہندی جن کو مسلم بنیاد پرستی کا جدّ امجد قرار دیا جاسکتا ہے، سے بھی کھلے دل و دماغ سے پیش آتا تھا۔ عبدالرحیم خانخاناں اکبر کے نورتنوں میں شامل سمجھا جاتا ہے اور فی الواقع وہ ایک ''درِ بے بہا'' تھا۔ فارسی زبان سے عشق اس کی فارسی شاعری میں جلوہ درجلوہ دکھائی دیتا ہے۔

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیگانہ است

نگاہ اہلِ محبت تمام سوگند است

یعنی لفظ ''عہد'' کا صدق و صفا میں کوئی مقام نہیں ہے ۔ کیوں

کہ محبت سے وابستگان کی نظر میں پیمان جز ولاینفک ہوتا ہے ایک رباعی ملاحظہ ہو

اے ساقی بہ ہماں محبت جامی
اے قاصد زغمزہ نہاں پیغامی
تاکی ہدف تیر تفاصل باشم
لطفی قہری، تبسّمی، دُشنامی

یعنی اے ساقی بے پناہ محبت سے ایک جام مجھے دے۔ اے قاصد مخفی اشارے ہی سے پیغام دوست سنا دے۔ آخر کب تک میں تیر تفاصل کا ہدف بنا رہوں گا۔ لفظ تفاصل محل نظر ہے۔ تفاصل یعنی دور رکھنا، محبت سے بھرپور جام، پیغام آگیں غمزہ سے مجھے کب تک دور رکھا جائے گا۔ مصنف نے تفاصل کو تغافل سمجھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

شیخ سلیم احمد نے کتابیات کے تحت انگریزی، فارسی، اردو تصنیفات جن سے انہوں نے استفادہ کرتے ہوئے زیر تبصرہ کتاب کو سپرد قلم کیا، کی فہرست پیش کی ہے۔ فی الواقع شیخ صاحب نے بڑا کلیدی رول ادا کیا ہے اور بلا شک وشبہ ان کی تصنیف قومی یک جہتی کی جانب بھی متوجہ کرتی ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں مشترکہ تہذیبی رشتوں کو استوار کرنے میں پیش پیش رہے۔ ان کی ہندی شاعری اس دور کے مذہبی منظرنامے کو بھی پیش کرتی ہے۔ اور آج کل کے گھرتے ہوئے اندھیروں کو روشنی سے پھاڑنے میں معاون بھی ثابت ہوسکتی ہے۔

سراسیمہ آگیں زمانے میں رحیم کی شاعری کا مطالعہ کرنا نیز اس کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کی کاوشوں میں حصہ لینا بغایت سود مند اقدامات ہیں، اشاعت و طباعت سے دلچسپی جھلکتی ہے۔ اور کتاب کی

ترتیب و تہذیب دل کش ہے۔ اس نوعیت کی کتابوں کو نصابات میں بھی جگہ ملنا چاہئے۔ شیخ سلیم احمد صاحب فی الواقع ہمارے شکریہ کے حق دار ہیں۔

☆☆
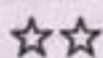
# رام لعل نابھوی

اس کتاب میں عبدالرحیم خانخاناں کی سوانح عمری۔ حالات زندگی، ان کی مہمات، سیرت و شخصیت، علم و ادب، ادب نوازی، تصوف، تعمیرات، شیخ احمد سرہندی سے اور شاہزادوں کے ساتھ تعلقات اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شروع میں تعارف ہے آخر میں کتابیات ہے۔ رحیم کے دوہوں کا نمائندہ انتخاب ہے۔ سب کچھ مصنف کا ہی ہے۔ ۱۶ تصاویر ہیں۔

مصنف بات اس زمانے سے شروع کرتے ہیں جب مسلمان سپاہی ہندو آقا کے لئے اور ہندو سپاہی مسلمان سپہ سالار کے لئے لڑتے تھے۔ وحدت الوجود اور وحدانیت کے نظریات اس سماج کی متحرک قوت تھی۔ مذہبی رواداری تھی۔ پھر کہتے ہیں کہ حضرت شیخ احمد سرہندی کے منظر عام پر آنے سے یہ بساط الٹ جاتی ہے اور دوسری بساط بچھتی ہے۔ جس پر مذہب کا رنگ غالب تھا۔ مجدد الف ثانی کی آمد کے ساتھ ہندوستان میں اسلام کے احیا کا آغاز ہوتا ہے۔ اور بنیاد پرستی اور کٹر مذہبیت کا دور شروع ہوتا ہے۔ مجدد عبدالرحیم کے ہم عصر تھے۔ خانخاناں کی مذہبی

شاعری کے معاملہ کو خاصا متنازعہ بتاتے ہوئے مصنف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ موجودہ ہندی کلام میں بیشتر خانخاناں کا ہے۔

اکبر کے دربار کا ذکر ہے جہاں شیخ عبدالنبی اور عبداللہ سلطان پوری مذہبی بحثوں میں سنی نقطہ نگاہ پیش کرتے ہیں۔ ان سے بادشاہ تک خوف کھاتا تھا۔ بعد میں خانخاناں کی زندگی کے حالات۔ اس کی شادی، خانخاناں کی پیدائش کا ذکر ہے۔ ہیمو بقال سے جنگ کی بات ہے۔ خانخاناں کے مرنے کا ذکر ہے۔ دربار میں ریشہ دوانیوں اور شاہزادوں سے خانخاناں کے تعلقات کا حال ہے۔ خوبیاں اور خامیاں بتائی گئی ہیں۔ خانخاناں کی زندگی میں اتار، چڑھاؤ کی بات بھی کھل کر بیان کی گئی ہے۔

آخر میں سب سے ضروری حصہ ہندی کی شاعری پر ہے۔ تصانیف کا حال درج کیا گیا ہے۔ دوہوں کو ہندی اور اردو میں لکھا گیا ہے اور اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ خانخاناں کی ایک مکمل دستاویز بنا دی جائے اور مصنف کامیاب ہیں۔ خانخاناں کے سبھی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب معلومات سے بھرپور ہے۔

☆☆

# سجاد نقوی پاکستان

مغلیہ سلطنت کے استحکام اور عروج میں جن دو ہستیوں کے نام یادداشت پر زور ڈالے بغیر لیے جاسکتے ہیں۔ وہ بیرم خاں اور عبدالرحیم خانخاناں کے ہیں۔ اپنے آقاؤں سے وفاداری کا جو معیار ان باپ بیٹے نے پیش کیا اس کی برصغیر کی تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ شیخ محمد سلیم احمد صاحب نے خانخاناں کی شخصیت کو

اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ مورخ کے لیے جس غیر جانبداری کی ضرورت ہوتی ہے شیخ صاحب نے خانخاناں کی مذہبی، سماجی اور سیاسی زندگی کے بیان میں اسے کہیں بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اصل میں شیخ صاحب کو اپنے ممدوح پر قلم اٹھانے کے لئے جس پہلو نے بطور خاص متاثر کیا وہ خانخاناں کا ہندی شاعری بالخصوص صنف دوہا میں ثقافتی اور وسیع المشربی کا سچا اظہار تھا۔ بیرم خاں اپنے بیٹے سے بڑھ کر سیاسی اور تاریخی شخصیت تھی مگر فنون لطیفہ سے اپنی دلچسپی اور بالخصوص شعرا کی پذیرائی اور خود اعلیٰ معیار کی شعر گوئی خانخاناں کو اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھیں۔ شیخ محمد سلیم نے کتاب کے آخری باب میں خانخاناں کے چند منتخب دوہے شامل کر کے اپنی تحقیق کا مضبوط اور واضح جواز پیش کیا ہے۔ نمونے کے طور پر ایک دوہے کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

> اوچھے یا کمینے شخص سے دور رہو۔ اس کی دوستی اچھی نہ دشمنی۔ اس
> سے نقصان ہی پہنچتا ہے جیسے کوئلہ گرم ہو تو ہاتھ جلاتا ہے۔ ٹھنڈا ہو
> تو کالا کرتا ہے۔

یہ کتاب تاریخ، سوانح اور شاعری سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے یکساں دلکشی کا سامان رکھتی ہے۔ اُجلی کتابت و طباعت کے ساتھ اس کتاب کی قیمت ۶۰ روپے نہایت موزوں ہے۔

☆☆

# علامہ اخلاق حسین دہلوی

سائز ۲۲×۱۸/۸ مسطر ۲۵ سطری کتابت و طباعت خوشنما و دیدہ زیب حجم ۸۰ صفحات مصور و مجلد قیمت ۸۰ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ خسرو کتاب گھر، ۱۵ بستی حضرت نظام الدین اولیا، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

کتاب مستطلب عبدالرحیم خانخاناں نامی گرامی قدر جناب شیخ سلیم احمد صاحب کی گرانقدر تصنیف ہے۔ جو مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی سوانح حیات ہے۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں شہنشاہ اکبر اعظم کے نورتنوں میں ممتاز ترین رتن تھے۔ اخلاق و اطوار، علم و فضل، شجاعت و دلیری۔ انتظامی صلاحیت و دینداری اور فیاضی میں آپ اپنی مثال تھے۔ بڑے باپ کے بیٹے اور بڑی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ عربی فارسی، ترکی ہندی سندھی گجراتی اور سنسکرت میں کمال دسترس رکھتے تھے۔ سخن سنج اور سخن گو بھی تھے۔ فارسی و ہندی میں ان کا کلام دستیاب ہوتا ہے۔ مشاہدہ شاہد ہے کہ ہر عہد میں ان کی سوانح حیات لکھی جاتی رہی ہے جو ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی علامت ہے۔

عہد حاضر میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پاکستان میں بھی ان سے متعلق تحقیق و تصنیف کا سلسلہ جاری ہے۔ ہندوستان میں گرامی قدر جناب شیخ سلیم احمد صاحب نے قلم اٹھایا اور داد تحقیق دی ہے جو لائق ستائش ہے اور ہر پہلو پر سیر حاصل معلومات فراہم کی ہے۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی ہندی شاعری پر بھی بھرپور لکھا ہے حتی کہ متعدد ہندی شعرا کا ذکر خیر زیر قلم آگیا ہے۔ جو اردو داں طبقے کے لیے از بسکہ مفید و کارآمد ہے۔

مرزا عبدالرحیم خانخاناں نے پورے شعور سے وہ زمانہ پایا تھا کہ جب اکبر اعظم کی توجہ بشدت تمام یکجہتی یگانگت اور ہندو مسلم اتحاد کی طرف ملتفت تھی۔ تاہم انسانی کوشش کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو سہو و خطا سے مبرّا نہیں ہوتی اور انبیاء علیہم السلام کی سعی جمیل کے ہم پلہ نہیں ہوتی جو رضائے الٰہی کے مطابق ہوتی ہے لہذا اس باب میں شہنشاہ اکبر اعظم سے جو لغزشیں سرزد ہوئیں۔ ان کے ازالہ کے لیے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد فاروقی و سرہندی نے توجہ فرمائی۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کا یہ اہم ترین دینی وصف ہے کہ وہ اس باب میں حضرت مجدد صاحب کے ہمنوا رہے۔ جس سے ان کی صالح فطرت آئینہ ہے۔ اور یہ ان کی بہت بڑی

خوبی ہے ورنہ عام یہ ہے کہ دولت و ثروت میں منہمک ہونے سے دینی قدروں کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اورانسان من مانی کرنے لگتا ہے لیکن یہ مرد مجاہد بکمالہ دینی قدروں کو سنبھالے رہا ہے۔ میرے یقین کے مطابق مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی مقبولیت میں یہی وصف سب اوصاف سے زیادہ کارفرما ہے۔ اسی لیے اس مرد مجاہد کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔

بہر حال گرامی قدر جناب شیخ سلیم احمد صاحب کی یہ قلمی کاوش بہت اہمیت کی مالک ہے خصوصاً اس لیے کہ اسلوب بیان سادہ سلیس عام فہم سنجیدہ و متین اور دلپذیر ہے۔ عوام بھی دلچسپی سے پڑھ سکتے ہیں وار خواص بھی البتہ حضرت مجدد صاحب سے متعلق ایسا کچھ بھی قلم سے کل گیا ہے جو حد ادب سے متجاوز اور نظرثانی کا محتاج ہے اور بس (دوسرے اڈیشن میں نظرثانی کی ہے)۔ میں گرامی قدر جناب شیخ سلیم احمد صاحب کی اس قلمی کاوش کو لائق پذیرائی تصور کرتا ہوں اور انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ متوقع ہوں کہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ مقبول ہوگی۔

لال محل بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

☆☆

# رئیس الدین فریدی

ہندوستان کی مسلم دور حکومت کی تاریخ میں امیر خسرو پہلی عظیم شخصیت نظر آتے ہیں جو صوفی بھی تھے، عالم بھی، ادیب بھی شاعر بھی، ماہر موسیقی بھی اور سپاہی بھی چونکہ انکی والدہ اک مسلم جاٹ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لیے ہندی زبان اور ہندو تہذیب سے انکا گہرا رشتہ تھا اور حد تو یہ ہے کہ ان کو اردو زبان کا بانی بھی مانا جاتا ہے جو اسی زمانے میں ہندی یا ہندوی ہی کہلاتی تھی۔

امیر خسرو جیسی صفات اور کمالات کا دوسرا نام مغلیہ دور حکومت میں عبدالرحیم خانخاناں کا ابھرا جو بیرم خان کے بیٹے تھے جن کی سلطنت مغلیہ کی بحالی میں بڑا ہاتھ تھا اور اسی تعلق کی وجہ سے عبدالرحیم نے بھی ہمایوں ار اکبر کے دور میں اس سلطنت کی حفاظت بقا اور توسیع کے لئے شاندار خدمات انجام دیں اور برسوں شاہی خاندان کا ایک فرد بنے رہے۔ ان کا ذکر ہندوستانی ادب میں ان کی زبان سے دلچسپی کی وجہ سے خاص طور پر آتا ہے اور بہت سے دوہے منسوب ہیں۔ شیخ سلیم احمد نے اردو پر یہ احسان کیا ہے کہ عبدالرحیم کے حالات زندگی بڑی محنت اور کوشش سے جمع کر کے شائع کر دئے ہیں۔ اس کتاب میں صرف بیرم خاں اور خانخاناں کے حالات ہی بڑی تفصیل سے اور معتبر حوالوں کے ساتھ درج نہیں ہیں بلکہ ان سے منسوب ہندی کلام کو بھی تشریح کے ساتھ یک جا کر دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس دور کے مذہبی، سماجی اور سیاسی حالات اور نشیب و فراز کی معلومات افزا تصویر کشی بھی کر دی ہے جو اس زمانے کے حالات کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ الغرض یہ کتاب نہایت قابل قدر ہے اور اہل علم اس سے کافی استفادہ کر سکتے ہیں۔
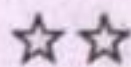
# انور کمال حسینی

شیخ سلیم عبدالرحیم خانخاناں کی اس مختصر سوانح میں ان کے عہد کے فکری دھارے کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ فکری دھارا بقول مصنف ایک مشترکہ تہذیب کا عکاس ہے کیوں کہ اس وقت ایک ایسا سماج وجود میں آچکا تھا

جس کی عام خصوصیات محبت، اخوت، رواداری اور صلح و آشتی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ صلح و آشتی، رواداری اور محبت و اخوت کے پرچار اور پھیلاؤ میں صوفی سنتوں، شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کی کوششیں مثبت ہوتی ہیں اور ان کے نتائج بھی نکلتے ہیں۔

آج کے حالات میں یہ کتاب بڑی باموقع ہے۔ کیوں کہ اس کتاب سے ایک مسلمان کی ہندی زبان کی چاہت، کرشن بھکتی اور سیکولر قدروں کی پاسداری سامنے آتی ہے۔

خانخاناں کی زندگی پر مواد بہت کم ملتا ہے، لیکن مصنف نے اپنی خیال آرائی کا استعمال کر کے معمولی حوالوں کو وسعت دی ہے۔

مصنف نے خود کہا ہے کہ یہ کتاب تحقیقی پیش کش ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں اور اس کے عہد کا سرسری تعارف ہے۔ اس لحاظ سے یہ اسکالرز کے لیے ایسا معتبر ماخذ نہیں بن سکتی جیسا کہ جدید وسائل و تحقیقات کی بنیاد پر اسے بنایا جا سکتا تھا۔ یہ کتاب دراصل خانخاناں کے لیے مصنف کی طرف سے شردھانجلی ہے۔ کیوں کہ مصنف نے خانخاناں کو اپنے ہیرو کا درجہ دیا ہے۔

بحیثیت مجموعی شیخ سلیم احمد شکریے کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر اردو اور ہندی کے اسکالرز کو خانخاناں کی طرف متوجہ کیا ہے۔

خانخاناں کی ہندی شاعری کے انتخاب میں محنت سے کام لیا گیا ہے اور خانخاناں کے دوہوں کے اس انتخاب کو ہندی اصل میں شائع کرنے کے ساتھ اردو میں ان کی وضاحت بھی دی گئی ہے۔ یقیناً رحیم کی شاعری اور رحیم کی اپروچ اور فکر کو سمجھنے کے لیے یہ ایک اچھا انتخاب ہے۔ بھکتی واد کے شاعروں میں خانخاناں کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کتاب کی قیمت اسّی روپے زیادہ ہے۔ جب کہ کتاب کی اشاعت میں ترقی اردو بیورو کا مالی تعاون بھی شامل ہے۔ ایسے مالی تعاون کا مقصد کتاب کی قیمت کم کرنا ہوتا ہے تاکہ قیمت کتاب دوست کی قوت خرید سے باہر نہ جاسکے۔

☆☆
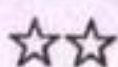
# رحیم کی کنڈلی

## زائچہ

جب بیرم خاں پنجاب میں ہیمو سے نبرد آزما تھا اور آخرکار اس کی شکست ہوئی اور وہ اکبر بادشاہ کے ہاتھ سے قتل کر دیا گیا، اس وقت بیرم خاں کا خاندان لاہور میں مقیم تھا۔ تمام سلطنت میں امن و امان کی فضا قائم تھی۔ اچانک سکندر سور نے دلّی پر حملہ کردیا۔ شاہی فوجیں وہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ بیرم خاں اکبر بادشاہ کے ساتھ تھا۔ وہ سکندر سور کا پیچھا کرتے ہوئے سرہند آگئے سکندر سور کے خلاف مہم جاری تھی۔ بادشاہ اور اس کا سپہ سالار دونوں میدان جنگ میں قسمت آزمائی کر رہے تھے۔ وہ دشمن کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور کی جانب بڑھ رہے تھے کہ راستہ میں انہیں یہ خوشخبری ملی کہ جمال خاں میواتی کی سب سے چھوٹی بیٹی سے بیرم خاں کے گھرانہ میں ایک چراغ روشن ہوا ہے۔ اس کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ یہ خبر سن کر بیرم خاں خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ اس کا نام 'عبدالرحیم' رکھا گیا۔ میدان جنگ میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ بوڑھاپے میں بیٹا پیدا ہوا تھا، اور بھی زیادہ خوشیاں منائی جارہی تھی۔ دلّی کے مولانا فریدالدین نے زائچہ بنایا اور تاریخ پیدائش نکالی ''در دربار سعادت'' (۹۶۴)۔ مآثر رحیمی جلد سوئم۔

بہت سے شعرا نے مبارکبادی کے قصیدے لکھے، تاریخیں نکالیں اور زائچے بنائے۔ مآثر رحیمی کے حوالے سے عبدالرحیم خانخاناں کی تاریخ پیدائش یہاں لکھتے ہیں۔ ۱۴ صفر ۹۶۴ ہجری، ۱۷ دسمبر ۱۵۵۶ عیسوی)۔

جب رحیم کی ہندی شاعری کا چرچا ہوا، تو اہل ہندی کو رحیم کی تاریخ پیدائش کی بھی جستجو ہوئی۔ انہوں نے ہندی اور انگریزی میں جنم کنڈلیاں بنائیں۔ ظاہر ہے ان کے ماخذ بھی فارسی اور ترکی رہے ہوں گے۔ تاہم رحیم کی کوئی کنڈلی فارسی یا ترکی میں دستیاب نہیں ہے۔ سنسکرت کے عالم اور ماہر علوم نجوم جو نجومیوں کے بادشاہ کہلاتے ہیں، انہوں نے اپنی کتاب "جاتک پدھتی ادھارن" میں رحیم کی تاریخ پیدائش و ساعت وغیرہ لکھی ہیں۔ وہ یوں ہیں۔ ساکا مال ۱۴۷۸ بکرمی سمبت ۱۶۲۳ یا ۱۵۵۶عیسوی لگن متھن، پیر کا دن۔ پھورے چاند کی رات۔ گراہایا مہینہ، شام ڈھل چکی تھی اور رات دو گھڑی اور ۵۵ پل گذر چکی تھی کہ لاہور میں رحیم کا جنم ہوا۔ پنڈت جی نے فارسی حوالوں سے یہ بات لکھی ہے۔

موجودہ جنم کنڈلی انگریزی میں ہے اور مایا شنکر یاگک کی کتاب رحیم رتناولی سے لی گئی ہے۔ یاگک کو رحیم کی ہندی شاعری کو منظر عام پر لانے کا فخر حاصل ہے۔ انہوں نے رحیم کی جنم کنڈلی کے لیے کوئی فارسی حوالہ نہیں دیا ہے۔ تاہم اسے ہم بڑے احترام کے ساتھ تبرک کے طور پر کتاب میں شامل کر رہے ہیں۔

DRAGON'S HEAD
MOON
1
SATURN
2
3
8
4
5
ASCENDENT
6
12
MARS
7
9
VENUS
11
MOON
JUPITER
MERCURY
8
DRAGON'S TAIL
10
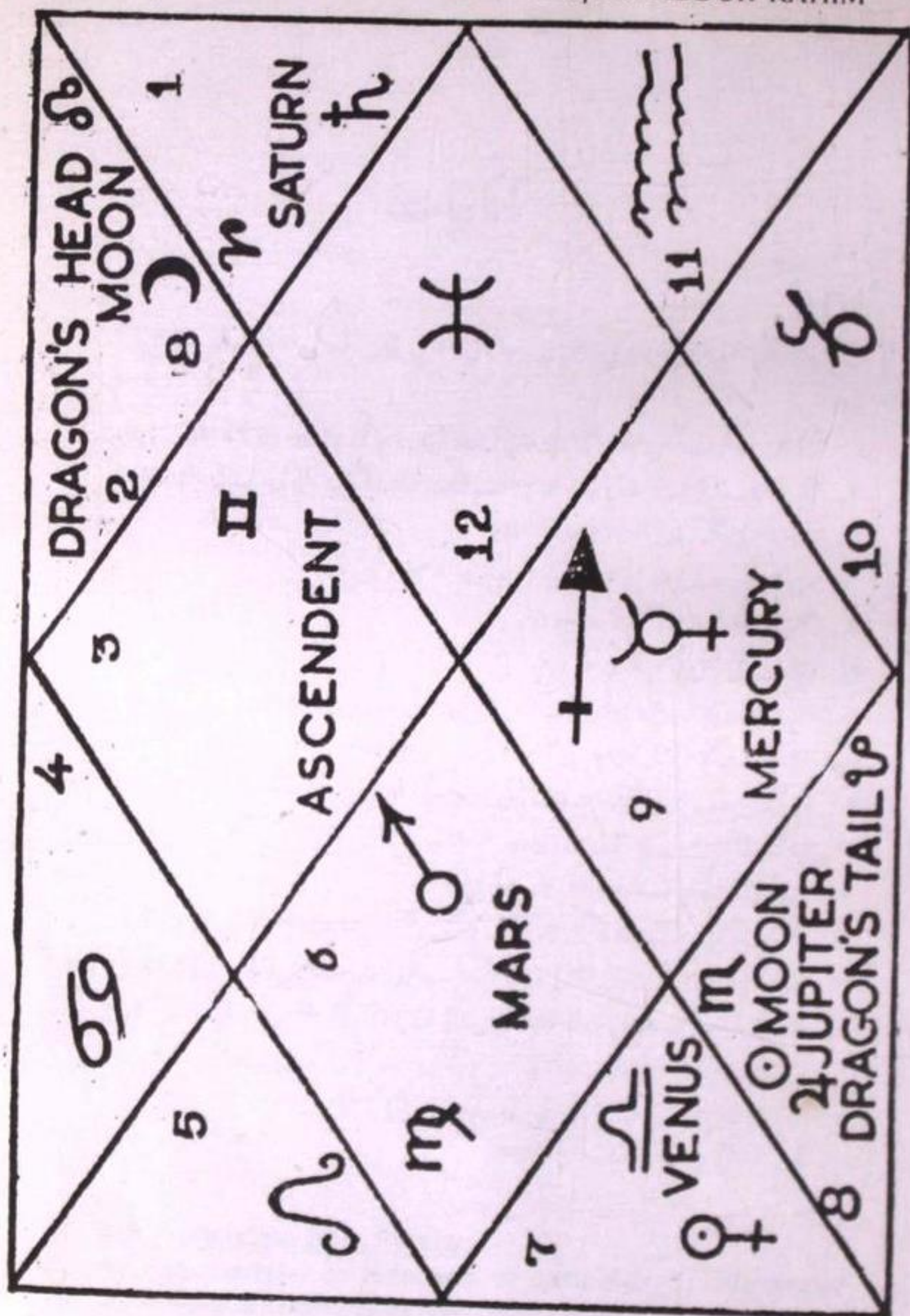
# کتابیات


## فارسی

۱۔ مآثر رحیمی، عبدالباقی نہاوندی، ایشیاٹک سوسائٹی، مغربی بنگال، کلکتہ۔ ۱۹۳۳ء، تین جلدیں

اردو

۱۔ مآثر الامراء، نواب شمس ادولہ شاہنواز خان (اردو ترجمہ) جانکی پرکاشن، پٹنہ ۱۹۷۹ء

۲۔ منتخب الباب (ترجمہ) حاجی خان نظام الملک (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۳ء

۳۔ دربار اکبری، محمد حسین آزاد، لاہور، ۱۹۳۹ء

۴۔ بزم تیموریہ، صباح الدین عبدالرحمٰن، اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء تین جلدیں

۵۔ شعرالعجم، شبلی نعمانی، اعظم گڑھ، جلد دوم

۶۔ مقالات شبلی، شبلی اعظم گڑھ، جلد دوم

۷۔ مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال، آر۔ ایس ترپاٹھی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۰ء

۸۔ مغلیہ سلطنت کا مرکزی نظام، این حسن، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۲ء

۹۔ اکبر سے اورنگ زیب تک، مورلینڈ، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء

۱۰۔ جہانگیر، ڈاکٹر بی پرساد، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۴ء

۱۱۔ تاریخ ہند، مولوی کاء اللہ، ۱۹۱۵ء جلد پانچ و چھ

۱۲۔ مکتوبات ربانی، ترجمہ مولانا شبیر احمد نقشبندی، منزل نقشبندیہ، لاہور، ۱۹۱۳ء

۱۳۔ عبدالرحیم خانخاناں کی ہندی شاعری، عبدالرشید، سہ ماہی رسالہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، جنوری ۱۹۳۴ء

۱۴۔ خانخاناں نامہ، منشی دیبی پرشاد کایستھ ملازم راج جودھپوری، تصحیح مقدمہ و حواشی، ڈاکٹر حسن علی بیگ، انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل ویسٹ ایشین اسٹڈیز، فیکلٹی آف آرٹس، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء

۱۵۔ محمد بیرم خان ترکمان، کوثر چاندپوری، کتاب گھر، بھوپال، ۱۹۳۱ء

۱۶۔ ملک عنبر، شیخ چاند، حیدرآباد، دکن، ۱۹۵۹ء

**<u>English Translation from Persian</u>**

**Tuzak-e-Jaqhangiri or Memoris of Jahangir**, Tr. Alexander Rogers Munshiram Manoharlal New Delhi 1978

**Muntakhabatu-T-Tawarikh Al-Badaoni,** Tr. V. I. Georg S. A.

Ranking, V. II W. H. Lowe, V. III Wolsetey Haig, Renaissance Publishing House, New Delhi 1986

**Akbaranama Abul Fazal,** Tr. H. Beveridge 3 Vols., Ess Ess Publication New Delhi 1987

**Ain-e-Akbari Abul Fazal,** Tr. Vl. H. Biochmann, V. II, III S. J:, Jarret Crown Publishing, New Delhi 1988

## English

**Indian Muslims, Prof. M. Mujeeb,** George Allen and Unwin London 1969, Cambrige History of India Vol-IV Wolsley Haig, S. Chand & Company, New Delhi 1979.

**A House Divided Amirit Raj,** Oxford University Press 1984, Reading in Indian History Mohammad Yasin, Atlantic Publisher & Distributor, New Delhi 1988.

**The Dhakhiratul Khawanin of Shaikh Farid Bhakkari,** (A Biographical Noblemen) Part I, Tr. Ziauddin A Desai, The Din-e-Akbar By Makhan Lal Roy Choudhary Das Gupta & Co. Calcutta 1952.

## Hindi

**Abdur Rahim Khan-e-Khanan,** Dr. Surya Prasad Aggarwal Central Hindi Directorate, New Delhi 1971.

**Rahim Granthawali,** Vidya Niwas Misr & Govind Rajmir Vani Prakashan, New Delhi 1985.

**Rahim Ke Sobodh Dohe,** Viyogi Hari Sasta Sahitya Mandal, New Delhi 1986.

**Bhaktkalin Sanskritee Chetna Mein Rahim Ka Gogden,** Dr. Arif Nazir, Bharat Parkashan, Aligarh, 1988.

**Abdur Rahim Khan-e-Khana His Literary Circle**, Dr. C. R. Naik, Ahmadabad University of Gujrat 1966.

**Rahim,** Dr. Sumar Bahadur Singh, National Book Trust, New Delhi 1967.

# حواشی

1. فارسی ادب میں 'مغل' لفظ کا مطلب تیموری ہے نہ کہ منگول۔ جہاں تک نسلی اصطلاح کا تعلق ہے مغل وہ خانہ بدوش، زراعت پیشہ لوگ ہو جو مشرق وسطی اور عظیم تر ایران کے رہنے والے تھے اور ترکی زبان بولتے تھے۔ دوسرے معنوں میں مغلوں کا مطلب اس مغل خاندان سے ہے جو ایک ہی سیاسی مقصد سے وابستہ تھے اور جس نے ایک خاندان کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ بابر اپنے باپ کی جانب سے تیمور کی پانچویں نسل میں تھا اور ماں کی طرف سے چنگیز خاں کا چودھواں جانشین۔ وہ چغتائی ترک تھا، اس لیے کہ اس کا آبائی وطن چغتائی خاں کی جاگیر میں تھا۔

2. عبدالقدوس گنگوہی (ردولوی) ان کے فرزند و سجادہ نشین نے ان کے حالات زندگی لطائف قدوسی کے نام سے لکھے ہیں جس میں وہ لکھتے ہیں کہ شروع میں شیخ ردولی میں رہتے تھے مگر سلطنت کی بدنظمی کے باعث یہاں پر اہل ہنود کا غلبہ ہوگیا تو شیخ نے ردولی سے ہجرت کی ۱۴۹۰ء میں شاہ آباد اور وہاں طویل قیام کے بعد گنگوہ (سہارنپور) تشریف لے گئے۔

لطائف قدوسی سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالقدوس مغلوں سے ناراض تھے۔ ۱۵۲۶ء میں جب بابر کے ساتھ ابرہیم لودی کا پانی پت میں معرکہ ہوا تو شیخ ابراہیم کی فوج میں تھے۔ وہ ابراہیم کو کہتے تھے کہ تمہاری فتح مشتبہ ہے۔ شیخ بابر کی فتح ہوئی شیخ بھی گرفتار ہوئے اور مرشد کی کالی پگڑی گلے میں ڈال کر انہیں پا پیادہ پانی پت سے دلّی لایا گیا۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو لودھیوں بالخصوص سکندر لودھی سے خاص تعلق خاطر تھا کہ اس نے اسلامی شعائر کی طرف رجوع کیا تھا۔ انہوں نے بھی سلاطین و امرا کے نام بہت سے خطوط لکھ کر تبلیغ اسلام کی۔ اس معاملے میں وہ مجدد الف ثانی کے پیش رو تھے۔ ۱۵۳۷ء میں شیخ کا انتقال ہوا۔

3 مجلس حضرت بندگی میاں مصطفےٰ گجراتی، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔ (۱۳۶۷ء) مصطفےٰ گجراتی بوہرہ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا ور سید محمد جونپوری کا مرید تھا۔ اکبر بادشاہ نے اسے گجرات سے طلب کیا تھا اور مہدوی نظریات کے بارے میں اس سے معلومات حاصل کی تھیں۔

4 شیخ مبارک ایک زمانہ میں مہدوی سمجھے جاتے تھے۔ پھر وہ نقشبندی اور بعد میں شیعہ ہوگئے تھے۔ اس کے بعد دین الٰہی قبول کر لیا۔

5 ہیمو بقال کا اصل نام ہیم راج تھا۔ وہ چھوٹی ذات کا ہندو تھا۔ تاریخ میں ہیمو بقال کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ریواڑی کے ایک مقام دیولی سچاری کا رہنے والا تھا۔ اس نے بکرماجیت کا خطاب اختیار کر لیا تھا۔ اکبر کے ایک امیر شاہ قلی محرم بہارلو کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی۔

6 سلیمہ بیگم کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ عبدالرحیم خانخاناں کی حقیقی ماں تھی یہ غلط ہے۔ وہ سوتیلی ماں تھی۔ سلیمہ بیگم سے شادی کے چار سال بعد ہی اس کے شوہر بیرم خاں کو قتل کر دیا گیا۔ اور سلیمہ جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی۔ وہ ایک اچھی شاعرہ تھی۔ مخفی تخلص کرتی تھی۔ خوبصورت اور عقلمند تھی۔ اسے خدیجہ عصر کا خطاب دیا گیا تھا۔ مغل عہد میں وہ بہت بعد تک زندہ رہی اور شہزادہ سلیم نے جب باپ کے خلاف بغاوت کی تو اس نے مصالحت کرانے میں اہم رول ادا کیا۔ وہ خود الہ آباد گئی اور شہزادہ کو لاکر باپ کے قدموں میں ڈال دیا۔ بیرم خاں کی موت کے بعد اکبر نے خود سلیمہ بیگم سے شادی کر لی۔ سلیمہ کا ایک شعر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

کاکلت رامن زمستی رشتہ جان گفتہ ام
مست بودم زنگی سبب مصرف پریشان گفتہ ام

(ترجمہ: میں سرمستی میں تیری زلف کو رشتہ جاں لکھ گیا تھا کیوں کہ میں مست تھا اس لیے اس قسم کی بے معنی گفتگو کی)

7 ماہم انگا (انگہ) کو مغل تاریخ میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اکبر کی وہ دایا تھی اگرچہ اس نے اسے دودھ نہیں پلایا تھا مگر بادشاہ اسے ماں کا درجہ دیتا تھا۔ وہ امور سلطنت میں دخیل تھی۔ اکبر کی تخت نشینی کے ابتدائی سالوں میں اسی کا حکم چلتا تھا۔ اس نے بیرم کی مدد سے بادشاہ کو پوری طرح اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ اس لیے اکبری عہد کے اس دور کو ''پیٹی کوٹ گورنمنٹ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اکبر نے جس طرح بیرم خاں سے نجات حاصل کی، اسی طرح بعد میں ماہم انگا

سے بھی چھٹکارا پالیا۔ ماہم کا ایک بیٹا مرزا عزیز کوکلتاش تھا جو محمد خاں اعظم کے نام سے بھی مشہور ہے۔ وہ مغل دربار میں ممتاز عہدوں پر کام کر چکا تھا۔ اکبر کا منہ چڑھا تھا۔ بڑا بدتمیز اور بدمزاج تھا۔ اکبر کی پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی کرتا تھا۔ اس کے مذہبی خیالات کو بھی ناپسند کرتا تھا۔ بھرے دربار میں گستاخی سے بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ اکبر اس کی گستاخیوں سے چشم پوشی کرتا تھا اور اکثر یہ کہا کرتا تھا کہ میرے اور کوکلتاش کے بیچ دودھ کی نہر بہتی ہے۔ وہ میرا رضاعی بھائی ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں کی شادی کلتاش کی بہن ماہ بانو سے ہوئی تھی۔

8. پٹن گجرات کے محسانہ ضلع میں ہے اور ایک سیرگاہ ہے۔ سہس ہندی میں ہزار کو کہتے ہیں۔ لنگا سے مراد لنگا مندر ہے اور تلاؤ تالاب کو کہتے ہیں۔ اس جھیل کے چاروں طرف ایک ہزار لنگا مندر تھے۔

9. یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اکبر کو عبدالرحیم خانخاناں کے معاملات میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی تھی اس کی ایک وجہ تو یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اکبر نے اس کے باپ کے اقتدار کو ختم کردیا تھا مگر مغل سلطنت کے استحکام کے لئے بیرم خاں نے جو قربانیاں دی تھیں وہ ان کا دل سے معترف تھا۔ دوسری سب سے بڑی وجہ بیرم خاں کی بیوہ سلیمہ بیگم تھی جس سے اکبر نے شادی کر لی تھی۔ سلیمہ بیگم غیر معمولی حسن و جمال اور صلاحیتوں کی مالک تھی اور اکبر کی شخصیت پر اس کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ رحیم اس کا بیٹا تھا سوتیلا ہی سہی مگر وہ اس سے محبت کرتی تھی اور اس کی سیرت کی تعمیر میں اس کا بھی حصہ تھا۔

10. سرکھیج آج بھی گجرات کے سیاحوں کے نقشہ پر ہے۔ یہ اپنی تاریخی عمارتوں کے لیے مشہور ہے۔ ایک تالاب کے گرد سلطان بیگوہ اور اس کی رانی بائی کے مزارات ہیں۔ گجرات کے مشہور صوفی احمد کھٹو گنج بخش کا مقبرہ اور مسجد کی عمارتیں یہاں موجود ہیں۔ اس صوفی کے نام پر احمد آباد کا نام پڑا۔ سرکھیج کے فن تعمیر کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ یہاں کی عمارتوں میں کوئی محراب نہیں ہے۔ اسے مغل فن تعمیر سے ممتاز کرتی ہے۔ سرکھیج کپاس اور نیل کی منڈی بھی ہے۔ معارف احمدی میں لکھا ہے کہ گجرات کے حکمراں احمد شاہ کے روحانی پیرو مرشد اولی شیخ احمد کھٹو جو سرکھیج میں رہتے تھے کے مشورہ پر ۲۷ فروری ۱۴۱۱ء کو احمد آباد شہر کی بنیاد رکھی۔ (گزیٹیر آف انڈیا صوبہ گجرات ضلع احمد آباد ۱۹۸۴)

11. ذخیرۃ الخوانین۔ شیخ فرید بھکری۔ ترجمہ انگریزی ضیاء الدین ڈیسائی۔ صفحہ 88-80

12. مغلوں میں شراب کا عام رواج تھا۔ بلکہ شراب نوشی ان کی قومی پالیسی کا حصہ تھی۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے جب وہ منگول تھے تو پیگن کہلاتے تھے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا اپنی قبائلی زندگی کی بہت سی عادتیں انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ترک نہیں کی تھیں۔ ان میں شراب نوشی بھی ایک تھی۔ اوّلاً بادشاہ خود شہزادہ کو شراب نوشی کے آداب بتاتا تھا۔ شہزادہ سلیم کو خود اکبر نے شراب کا پہلا جام پیش کیا اور باقاعدہ اس کا جشن بھی منایا۔ بابر نے بڑے فخر سے شراب نوشی کی ان پارٹیوں کا ذکر کیا ہے جو بقول اس کے افکار و آلام کو ڈبو دیتی ہیں۔ ہمایوں نے شراب اور افیون سے اپنی صحت برباد کی۔ اس کے ایک لڑکے محمد حکیم نے صرف ۳۱ سال کی عمر میں شراب نوشی کی لت میں جان دی۔ اکبر گو سب سے کم شراب پیتا تھا مگر بعض اوقات وہ بھی کثرت سے پیتا تھا۔ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے کہ ''میں شراب کا عادی نہیں تھا۔ایک بار ایک ملازم نے شکار سے واپسی پر تھکن اتارنے کے لیے ایک جام پیش کیا۔ اس کے بعد مجھے عادت ہوگئی۔ جب شراب انگوری سے تسلی نہیں ہوئی تو سپرٹ پینے لگا۔ بیں جام روز پیتا تھا۔ چودہ جام دن میں باقی رات میں۔ اس کا وزن ہندوستانی ۶ سیر اور ایرانی ایک مَن ہوتا ہے۔ میری خوراک روٹی اور سبزی کے ساتھ ایک مرغ تھی۔ نشہ کی حالت میں جام اپنے ہاتھوں سے نہیں تھام سکتا تھا۔ دوسرے لوگ مجھے پلاتے تھے۔'' کشمیر کے سفر میں نور جہاں، آصف خاں، شہریار، داد بخش اور دوسرے امرا اس کے ہمراہ تھے، بادشاہ کو دمہ کی شکایت تھی اور دن بدن وہ کمزور ہوتا جاتا تھا۔ اس کی بھوک بالکل جاتی رہی حتیٰ کہ افیون بھی اب کچھ کام نہ کرتی تھی۔ وہ انگوری شراب کے چند پیالوں کے سہارے زندہ تھا۔ آخری وقت میں بھی اس نے شراب کا جام مانگا جو اس کے منہ سے لگا دیا گیا۔ مگر وہ اسے پی نہ سکا اور انتقال ہوگیا۔

13. اس اقتباس سے جہانگیر اور خانخاناں کے باہمی تعلق پر روشنی پڑتی ہے اس بیان میں ہلکی سی طنز کی آمیزش بھی ہے۔ خانخاناں جہانگیر کا اتالیق رہ چکا تھا۔ وہ بچپن میں دونوں ساتھ کھیلتے تھے۔ خانخاناںؒ کے ساتھ بھی اس کے تعلقات خوشگوار نہ رہ سکے۔ شہزادہ کی حیثیت سے جہانگیر کا بچپن عیاشی اور شراب نوشی میں گزرا۔ وہ ایذا پسند شہزادہ تھا۔ اگرچہ اس کی

تعلیم و تربیت اعلیٰ پیانہ پر ہوئی تھی۔ مگر اس کی سیرت پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔

14 جہانگیر بڑی آرزوؤں اور منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اکبر ایک ولیعہد کے لیے دعاؤں کے ساتھ ساتھ وہ پیروں کے پاس جاتا ار مزاروں پر بھی حاضری دیتا تھا۔ اکبر اس زمانہ کے بزرگ صوفی شیخ سلیم چشتی کے سامنے حاضر ہو کر ان سے دعا کی درخواست کرتا کہ مغل سلطنت کو ایک ولیعہد نصیب ہو۔ شیخ سلیم چشتی (۹۷۔۱۴۷۸۔۱۵۲۷) بن بہاء والدین چشتی آگرہ کے قریب سیکری پہاڑیوں میں جو اس وقت جنگل تھا ایک حجرہ میں رہتے تھے۔ وہ بابا فرید کے وارثوں میں سے تھے۔ ان کی وجہ سے سیکری شمالی ہند کا ایک اہم روحانی مرکز بن گیا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ کے مصنف جن کا جوانی کا عالم تھا وہ بھی متاثر تھے۔ دونوں میں خط و کتابت تھی۔ حضرت شیخ نے بہت سے حج کیے اور بہت سی شادیاں بھی کیں۔ ان کا زیادہ تر وقت عرب ممالک میں گذرا۔ اکبر ان کا معتقد تھا۔ ان کی دعاؤں سے شہزادہ سلیم پیدا ہوا۔ حضرت شیخ کے نام ہر شہزادہ کا نام سلیم رکھا گیا۔ سیکری پہاڑیوں سے پتھر کاٹنے والے مزدور شیخ کے حلقہ بگوش تھے۔ آگرہ کا قلعہ تعمیر ہو رہا تھا اور یہ پتھر وہاں لے جائے جاتے تھے۔ اکبر نے سیکری میں ایک شہر بنانے کا حکم دیا اور اسے آگرہ سے جوڑ دیا گیا۔ بعد میں جب آگرہ کو منحوس قرار دیا گیا تو دارالخلافہ سیکری منتقل کر دیا گیا جسے فتح پور سیکری کا نام دیا گیا۔ حضرت شیخ نے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ انتقال کے بعد شیخ کو اسی مسجد کے صحن میں دفنایا گیا۔ مسجد و مزار آج بھی مغلوں کی فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ بڑی دعاؤں کے بعد جب سلیم پیدا ہوا تو اکبر پا پیادہ اجمیر خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر پہنچا جن کے مزار پر اس نے منت مانی تھی۔ آگرہ سے اجمیر تک ۲۲۸ میل کا یہ فاصلہ اس نے پیدل طے کیا جو صوفیوں کے تئیں اس کے عقیدہ و محبت کی دلیل ہے اور اس بات کا ثبوت بھی کہ وہ بیٹے سے کس درجہ محبت کرتا تھا۔ اکبر پریشان ہو جاتا جب ماں کو ذرا سی بھی تکلیف ہوتی جس کے پیٹ میں ولی عہد سلطنت پروان چڑھ رہا تھا۔ رانی جہانگیر کی ماں جو راجپوتنی تھی آگرہ سے فتحپور سیکری منتقل کر دی گئی تاکہ شیخ سلیم چشتی کی قربت رہے اور اس لیے بھی کہ آگرہ شہر ''منحوس'' قرار دے دیا گیا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ چیتے کے شکار کے لیے گیا تھا کہ ماں کے پیٹ میں بچہ کی حرکت بند

ہوگئی، بادشاہ کی نیند حرام ہوگئی۔ عہد کیا کہ چیتے کا شکار نہیں کھیلے گا۔ اپنے زمانہ کے بہترین عالموں نے اسے تعلیم دی تھی۔ شرفا کی بیگمات نے اتا کے فرائض انجام دیے تھے۔ ایسے ناز و نعم میں پلا بیٹا ناخلف اور ناکارہ ثابت ہوجائے تو باپ کے دل پر کیا گزرے گی، شہزادگی کا سارا زمانہ باپ کے خلاف بغاوتوں میں گزرا۔ خود باپ کو آنکھیں دکھاتا تھا۔ طرح طرح سے باپ کی دلآزاری کرتا تھا۔

لیکن قسمت کا دھنی تھا کہ تاج شاہی سر پر رکھا گیا۔ دو بھائی (مراد اور دانیال) جو تخت کے امیدوار ہو سکتے تھے پہلے ہی ملک عدم کو رخصت ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ بادشاہ اپنی زندگی ہی میں اس کی ولیعہدی کا اعلان کر گیا تھا۔ حالات نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ بہت سے علما اکبر کی غیر اسلامی پالیسیوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ انہوں نے جہانگیر کی مدد کی کہ وہ اسلامی شریعت کو نافذ کرے گا۔ اکبر کے دربار کے اک ممتاز امیر شیخ فرید بخاری تھے جو اپنی غیر جانب داری، جرأت اظہار اور داد و دہش کی وجہ سے دربار میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ جہانگیر کو بادشاہ بنانے میں ان کا نمایاں رول تھا۔ بادشاہ ابھی بستر مرگ پر تھا۔ زبان بند ہو چکی تھی۔ شیخ فرید، شہزادہ کو بادشاہ کے قریب لے گیا اور خادموں سے کہا کہ بادشاہ کی پگڑی جہانگیر کے سر پر رکھ دیں۔ یہ اعلان تھا اس کی بادشاہت کا۔ شیخ فرید کے سامنے کسی دوسرے کو مخالفت کی ہمت نہ ہوگی۔

اگرچہ کچھ امرا جہانگیر کے بیٹے خسرو کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ اور وہ تھا بھی بادشاہت کے لائق۔ بہت سی باتوں میں وہ بادشاہ سے بہتر تھا۔ اس نے ابوالفضل اور ابوالخیر کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندی فلسفہ سیکھا تھا جس کا استاد شیودت تھا۔ اس نے سنسکرت زبان بھی سیکھی تھی۔ سپاہی بھی بہت اچھا تھا۔ شراب اور عورت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ وجیہ اور خوبرو تھا اور دربار میں مقبول بھی۔ اپنے دادا اکبر کی بہت سی خوبیاں اس میں نظر آتی تھیں۔ وہ شاید ایک کامیاب حکمراں ثابت ہوتا مگر ستارے جہانگیر کا ساتھ دے رہے تھے۔ پھر باپ کی موجودگی میں بیٹے کا بادشاہ بنانا تاتاریوں کی روایت کے خلاف تھا۔

جہانگیر کی شہزادگی کا زمانہ بے راہ روی میں گزرا مگر پھر بھی اسے راسخ العقیدہ طبقہ کی

حمایت حاصل تھی مگر عنان حکومت سنبھالنے کے بعد وہ بالکل بدل گیا۔ وہ اکبر سے زیادہ وسیع النظر، سیکولر اورآزاد خیال ثابت ہوا۔ انصاف پسندی کو اس نے اپنی حکومت کی اساس بنایا۔ وہ خود مذہبی نہ تھا لیکن سیاسی مصلحتوں کی بنا پر کٹر بنیاد پرست علما کی حمایت کرتا تھا۔ اس نے علما کے اس طبقہ کو خوش کرنے کے لیے مذہبی اختلاف کی بنا پر سزائیں بھی دیں۔ اس کی تمامتر فراخدلی اور آزادی خیال کے باوجود اس کے عہد میں اسلام کی احیاپرست طاقتوں کوفروغ حاصل ہوا۔ (مصنف)

آصف خاں اس کا خطاب تھا۔ مختلف اوقات میں مختلف خطابات جیسے یمین الدولہ، اعتقاد خاں مل چکے تھے۔ وہ مشہور وزیر اعتماد الدولہ (نوجہاں بیگم کا بھائی) کا بیٹا تھا۔

15. ایک ابھرتی ہوئی زندہ قوم کے عزت نفس کے جذبہ کی ایک مثال

16. کسی دوسری بیگم سے پیدا ہوا ہوگا۔ جہاندار وشہریار دونوں ہم عمر تھے۔

17. وہ عبدالرحیم خانخاناں کے درباریوں میں سے تھا۔ صوفی منش انسان تھا۔ خطوط نویسی میں ماہر تھا۔ اس کے لکھے سیاسی خطوط بہت پسند کیے جاتے تھے۔ وہ اسلامیات و نجوم کا ماہر تھا۔ اچھا مفسر قرآن تھا۔ حساب کتاب بھی جانتا تھا۔ سلطان ابرہیم شاہ دوم کے دربار میں مغلوں کا سفیر رہا، غریبوں کا دوست تھا، رحیم کا داد ماد تھا۔

18. صد کس بہ نظر نگاہ می داریم
ورنہ پریدی زبے آرامی

19. ماثرالامرا میں خانخاناں کی چالاکی کے بارے میں ایک شعر بھی لکھا ہے جس کا اردو ترجمہ کچھ اس طرح ہے:

ایک چھوٹا قد اور دل میں سیکڑوں پیچ و خم
مٹھی بھر ہڈیاں اور سو مکاریاں

20. ماثر رحیمی کا انگریزی ترجمہ Abdur Rahem Khan-e-Khana & His history Circle کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں تمام مشہور علما کا ذکر ہے جو ہم عصر تذکرہ ہے اس کے مصنف سی۔آر۔ نائک ہیں اور کتاب گجرات یونیورسٹی احمد آباد 1966 میں شائع کی تھی۔

21. حضرت شیخ نے یہ کیسے جان لیا کہ نجات والا فرقہ صرف اہل سنت و جماعت ہے۔ یہ بات تو

صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اب ان کے بیان کی تصدیق کے لیے قیامت تک انتظار کرنا ضروری ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی خط میں بیان کیا ہے کہ میرے مشائخ سے غلبہ سکر میں اگر کفر و الحاد کی تعریف ہوجاتی ہے تو اس کے ظاہر معنی مراد نہ لیے جائیں۔ ان کی تاویل لابدی ہے۔ چہ خوب است۔

21۔ برصغیر میں نفرت کی اس تبلیغ کا خمیازہ مسلمان آج تک بھگت رہے ہیں۔ اس عہد میں صوفیا کا بڑا طبقہ ہندو مذہب کی ان علامتوں کا استعمال اپنے کلام میں کرتا تھا جن کی مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں۔ رحیم نے بھی اپنی شاعری میں اس طرح کی علامتیں استعمال کی ہیں۔

22۔ شیخ سلطان حضرت مجدد کے خسر تھے جن کی خانخاناں نے اپنے سندھ کے قیام کے دوران مدد کی تھی ملا عبدالقادر کے شعبے میں ترجمے کا کام کرتے تھے۔ مکتوبات امام ربانی (اردو ترجمہ) مولانا محمد سعید احمد نقشبندی۔ خطیب و امام حضرت داتا گنج بخش ناشر فیصل پبلشنگ ہاؤس۔ محلہ ابوالمعالی دیوبند ۱۹۵۸ء

23۔ سادات بارہہ۔ بارہ ۔ یہ سید تھے۔ بڑے بہادر اور جنگجو تھے۔ مغلوں سے انہوں نے کئی جنگیں لڑیں۔ ذخیرۃ الخوانین میں سادات بارہ کے بارے میں لکھا ہے:

"بارہہ کا مطلب ہے بارہ گاؤں۔ یہ گاؤں گنگ و جمن کے دوآبہ سنبھل پرگنہ میں واقع تھے۔ سید محمود بارہہ اس خاندان کا سربراہ تھا۔ محمود بارہ اپنے قبیلہ کا سب سے اچھا بہادر تھا۔ وہ پنج ہزاری منصب پر فائز تھا۔ بہادری اور دریا دلی میں شہرت پائی۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ (عرش آستانی) نے اپنے بٹریلہ کے راجہ کے بیٹے مدھوکر کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا تھا۔ میران (سید محمود) نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے جو اس سے امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ کامیاب و کامران لوٹا۔ شاہی دربار میں اس نے بڑی شیخی بگھاڑی "میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا" آصف خاں نے اسے ٹوکا "میراں جی، یہ کامیابی آپ کو بادشاہ کے اقبال سے ملی ہے۔ میران نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ میدان جنگ کوئی اقبال وقبال نہیں۔ یہ میں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ لڑی۔ بادشاہ کا اقبال نام کا آدمی وہاں نہیں تھا۔ میران کی اس سادگی پر بادشاہ ہنسا اور اسے کئی شاہی انعامات و خطابات سے نوازا۔

ایک دن پانچ ہزاری منصب والوں کی میٹنگ تھی۔ میٹنگ میں ایک سردار نے میراں جی سے

مذاق میں پوچھا: ''بارہہ سید کا شجرہ کہاں تک جاکر ختم ہوتا ہے۔ کچھ کا خیال ہے تم لوگ سید نہیں ہو۔ یہ سن کر میراں جی بھڑک گئے اور جو آگ جل رہی تھی اس میں کود پڑے اور آگ کے بیچ کھڑے ہوگئے اور بولے اگر میں سید نہیں ہوں تو جل جاؤں گا ورنہ آگ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ وہ آگ میں ایک گھنٹہ کھڑے رہے۔ درباریوں نے بڑی منت سماجت کی اور خوشامد کرکے میراں جی کو آگ سے باہر نکالا۔ ان کے پاؤں پر آگ کے جلانے کا نشان تک نہ تھا۔ (صفحہ۔ 33-132)

24 پرانیام۔ حبس دم کو کہتے ہیں۔ نقشبندی صوفیوں کی اہم ریاضت میں شامل ہے۔ حبس دم سنٹرل ایشیا سے صوفیا کے ذریعہ ہندوستان پہنچ کر پرانیام کا ہم معنی قرار پایا۔ پرانیام، حبسِ دم سے قدیم ہے۔

25 اس عہد کے سلاطین کا طرز فکر ہندی زبان کے فروغ میں معاون ثابت ہو رہا تھا۔ غزنوی اور غوری کے سکوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ہندو اور مسلمانوں کے باہمی ارتباط کی فضا پیدا کی جا رہی تھی جس کی وجہ سے ایک نئی زبان وجود میں آرہی تھی۔ سلطان محمود غزنی کے سکہ کے ایک طرف عربی اور دوسری طرف سنسکرت لکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف گھوڑ سوار کی شبیہ تھی تو دوسری طرف نندی بیل گائے کی۔ ایک طرف 'سری ہمیر' لکھا ہوتا تھا تو دوسری طرف 'سومنت دیو' یہ دونوں نام سنسکرت رسم الخط میں لکھے ہوتے تھے۔ معز الدین محمد غوری کے سکوں پر تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر لکشمی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

26 सुरतिया नरतियाए नागतीया सब चाहत उप हीय।

27 गोद लिये हू तुलसी फिरेए तुलसी सो सूत होय।।

☆☆

شیخ سلیم احمد ہندوستان کے معروف دانشور، مفکر اور اہل قلم ہیں جنہوں نے علم و ادب کے کئی شعبوں کو اپنے مطالعہ اور تفکر سے روشن کیا ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں جس کا اظہار متعدد اصناف سخن پر ان کی دسترس سے ہوتا ہے۔ انہوں نے تنقید کے ساتھ ساتھ افسانے، انشائیے اور ڈرامے لکھے ہیں اور تراجم بھی کئے ہیں۔ اس سب کے ساتھ شیخ صاحب کی فہم و فکر کا محور اور علمی اختصاص ہند اسلامی، ایرانی تہذیب ہے جس کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں تک ان کی رسائی ہے۔ تصوف اور بھکتی تحریک کے معنی و مفہوم کا جیسا درک انہیں حاصل ہے اور کہیں کم نظر آتا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں شعبہ ثقافت ہند نے یونیسکو کے تعاون سے حضرت امیر خسرو دہلوی پر سات سو سالہ بین الاقوامی جشن منانے کا اہتمام کیا تو انہیں اس سلسلے میں تشکیل شدہ قومی کمیٹی کی مجلس عاملہ کا رکن بنایا گیا۔ انہوں نے اس حیثیت سے نہایت قابل قدر کام انجام دیا۔ اس موقع پر امیر خسرو پر ان کی مرتب کردہ ضخیم کتاب شائع ہوئی جو حوالہ جاتی اہمیت کی حامل ثابت ہوئی۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا۔ اسی زمانہ میں مشی گن یونیورسٹی امریکہ میں امیر خسرو پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا، وہ ہندوستانی وفد کے ہمراہ اس سمینار میں شرکت کے لئے گئے اور مقالہ پیش کیا۔

ان کی کتاب 'عبدالرحیم خانخاناں' جو اُردو ہندی میں شائع ہوئی۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ہندی ایڈیشن پر سرکاری انعام بھی ملا۔ انہوں نے عبدالرحیم خانخاناں میموریل سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم بھی بنائی جس کے تحت امیر خسرو، تصوف کی عصری اور سماجی معنویت، کبیر، ہندی بولیوں وغیرہ جیسے کئی اہم موضوعات پر سیمینار منعقد کئے گئے۔ تصوف کی سماجی معنویت پر سیمنار کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند نے کیا اور پھر اس موضوع پر انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز (ICCR) نے بھی سمینار کا اہتمام کیا۔ شیخ صاحب تصوف اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب جیسے موضوعات پر مقالے پیش کرنے کیلئے امریکہ اور انگلینڈ کے سفر کر چکے ہیں۔ بیرم خاں پر ترکمانستان کے سفارت خانے اور حکومت ہند کے اشتراک سے چھ سو سالہ جشن منایا گیا تو ترکمنستان کے دار الخلافہ اشقآباد اور دلی دونوں مقامات پر تقریبات اور سمینار آراستہ کئے گئے۔ شیخ سلیم احمد نے ان تقریبات میں حکومت ہند کی نمائندگی کی اور دونوں شہروں میں رحیم اور بیرم خاں پر مقالے پڑھے اور سنٹرل ایشیا کی سیاحت کی۔ وہاں سنٹرل ایشیا کے صوفی سلسلوں پر مقالہ پڑھا۔ انڈین کونسل آف ہسٹریکل ریسرچ نے ہندوستانی اور وسط ایشیا کے مابین قدیم الایام رشتوں کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار کا اہتمام کیا جس میں موصوف نے 'نقشبندی صوفی سلسلہ' پر مقالہ پڑھا۔

وہ شعبہ ثقافت، حکومت ہند کے سینئر فیلو بھی رہ چکے ہیں جس کے تحت انہوں نے ''تصوف کے اُردو غزل پر اثرات' کے عنوان سے مقالہ تصنیف کیا۔ 'صوفی سنت پرمپرا آف انڈیا' کے نام سے انگریزی میں کتاب مرتب کی۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ 'جلسہ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ موصوف کے گرانقدر علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ بھی 'سلک معنی' اور اُردو، ہندی تنازع پر دوسری کتاب 'ایک گھر جو تقسیم ہو گیا' دونوں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

شیخ سلیم احمد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلیم حاصل کی۔ ایم اے میں ان کا مضمون 'ہندوستانی تہذیب اور تاریخ' تھا۔ مرکزی حکومت ہند کے ترقی اُردو بیورو میں کارگزار رہے ہیں اور ایک اعلیٰ عہدہ سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ وہ قصبہ دیوبند کے قریب شیوخ کی ایک بستی راجوپور میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک متمول زمیندار گھرانے سے ہے۔

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

81-8223-325-9